بیع وشراء پر اکراہ کے اثرات

*سید باچا آغا

Abstract

It is obligatory upon every Muslim to learn the rules of business transactions to the extent of his need. It is obligatory upon the scholars ('Ulamaa') to teach these rules to the people. It is recommended that the seller make no distinction between buyers in the price of a commodity nor be difficult nor swear (an oath). When the buyer regrets (the purchase) and seeks to cancel the transaction, (the seller should) accept the cancellation. Few necessary conditions must be fulfilled for a business transaction to be considered valid and binding in Islam. Both the buyer and the seller must willingly agree to all details of the transaction, due to the statement of the Prophet (PBUH):"Verily business transactions are only (valid) by way of mutual agreement." Thus, someone being forced to buy or sell property invalidates the transaction; however there is an exception to this. Shaykh Saalih al-Fawzaan states, "And if someone was justly forced into a sale, then it is legitimate. An example of this is when a judge forces someone to sell his property to pay his debt". However In this paper discussed about the Islamic point "*Ikra'h*" and its effects on buying and selling.

Keywords: Islam, Islamic law– Shariah, "Ikra'h", Buying, Selling.

تعارف:

عقائد وعبادات کی طرح معاملات بھی دین کا ایک اہم شعبہ ہے، جس طرح عقائد اور عبادات کے بارے میں جزئیات واحکام بیان کیے گئے ہیں، اسی طرح شریعت اسلامی نے معاملات کی تفصیلات بھی بیان کرنے کا اہتمام کیاہے، حلال وحرام، مکروہ اور غیر مکروہ، جائز اور طیب مال کے مکمل احکام قرآن وحدیث میں موجود ہیں اور شریعت کی دیگر جزئیات کی طرح اس میں بھی مکمل راہ نمائی کی گئی ہے، جو لوگ نماز اور روزہ کا اہتمام کرتے ہیں، مگر صفائی معاملات اور جائز وناجائز کی فکر نہیں کرتے، وہ کبھی اللہ کے مقرب نہیں ہوسکتے، اس لیے ان کا عمل شریعت پر ناقص ہے، افسوس ہے کہ عرصۂ دراز سے مسلمانوں کے درمیان معاملات سے متعلق جو شرعی احکام ہیں ان کی اہمیت دلوں سے مٹ گئی ہے اور دین صرف عقائد وعبادات کا نام سمجھا جانے لگا ہے۔

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج، سریاب روڈ، کوئٹہ۔

حلال و حرام کی فکر رفتہ رفتہ ختم ہو گئی ہے اور دن بہ دن اس سے غفلت بڑھتی جارہی ہے، جس کے سبب مسلمان اقتصادیات میں پیچھے ہیں اور خاطر خواہ معاشیات میں انہیں ترقی نہیں مل رہی ہے۔ اس لیے اہل علم اور فقہائے کرام نے قرآن وحدیث کی روشنی میں کام یاب اور نفع بخش تجارت کے لیے اصول بیان کیے ہیں، جن کی روشنی میں تجارت کی جائے تو دنیا میں بھی نفع ہو گا اور آخرت کے اعتبار سے بھی یہ تجارت بے انتہا اجر وثواب کا باعث ہو گی اور یہ تجارت دین کی سرگرمیوں میں شامل ہو جائے گی۔شریعت اسلامی وہ نظام قانون ہے جو دنیاوآخرت کے تمام احکام کو شامل وحاوی اور عالمی شان کا حامل ہے اور تمام مسائل زندگی کے احاطہ کی صلاحیت اس کا امتیازی وصف ہے۔ فقہاء اسلام نے اپنی بالغ نظری اور بلند نگاہی سے انسانی زندگی کے جزئیات کا اس قدر احاطہ کیا ہے کہ بجا طور پر آج کی اس نئی دُنیا میں بھی ایسے کم ہی مسائل ملیں گے جس کے لئے فقہ کے اس قدیم ذخیرہ میں کوئی نظیر موجود نہ ہو۔ جبر واکراہ ایک ایسا عام اور پھیلا ہوا موضوع ہے جس سے فقہ کا کوئی باب خالی نہیں جبکہ موجودہ زمانہ نے اس کو اور بھی طول دیا ہے، عقائد ہوں یا عبادات و معاملات، حدود و قصاص ہوں یا تبرعات، غرض کوئی باب اکراہ کے مسائل سے خالی نہیں، اس لیے ذیل میں بیع وشراء سے متعلق اکراہ کے مسائل ذکر کیے جائیں گے۔

اکراہ کی لغوی تعریف:

اکراہ باب افعال کا مصدر ہے جس کے معنیٰ ہیں کہ کسی چیز پر مجبور کرنا یا جبراً آمادہ کرنا، کہا جاتا ہے "اکرھه علی کذا" اسے اس نے فلاں کام پر مجبور کیا یا جبراً آمادہ کیا، ثلاثی مجرد سے باب سمع سے استعمال ہوتا ہے اور ناپسندیدہ ہونے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ کُرْہٌ (ضمہ کے ساتھ) اور کَرْہٌ (فتحہ کے ساتھ) دونوں قرآن کریم میں مذکور ہیں، سورۃ البقرۃ میں ہے "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ[1]" اور سورۃ النساء میں ہے "يٰاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا[2]" کُرْہٌ (بالضم) اور کَرْہٌ (بالفتح) میں عربیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، نیز سب حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ سورۃ البقرۃ کے علاوہ جہاں کہی بھی قرآن کریم میں کُرْہٌ یا کَرْہ ہے وہ مصدر ہے جبکہ سورۃ البقرۃ میں "وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ" اسم مصدر ہے، اسی طرح سارے ائمہ لغت اس

[1] البقرہ:۲۱٦

[2] النساء:۱۹

بات پر متفق ہیں کہ کُرْہٌ (بالضم) اور کَرْہٌ (بالفتح) دونوں لغت ایک ہی معنیٰ میں ہیں فتحہ اور ضمہ دونوں پڑھنا جائز ہیں سوائے امام فراء رحمہ اللہ کے، وہ فرماتے ہیں کہ کُرہ (ضمہ کے ساتھ) مشقت اور تکلیف کے معنیٰ میں جبکہ کَرہ (فتحہ کے ساتھ) اکراہ یعنی مجبور کرنے کے معنیٰ میں ہے، کہا جاتا ہے: اقام علی کُرہ: وہ بڑی مشقت کے ساتھ کھڑا ہوا، اور اقامہ علی کَرہ: فلاں آدمی نے اسے مجبور کر کے اٹھایا۔

اکراہ کی اصطلاحی تعریف:

فقہی اصطلاح میں ناحق کسی شخص کو اس کی رضامندی کے بغیر کسی کام کے کرنے پر ڈرا کر مجبور کرنا اور اس کی وجہ سے مکرَہ کی اہلیت ختم ہوئے بغیر اس کا اختیار بیکار ہو جانا اکراہ ہے۔ مختلف فقہاء کرام نے اسی مفہوم کو مختلف انداز میں بیان فرمایا ہیں۔

شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

الإكراه: اسم لفعل يفعله المرء بغيره فينتفي به رضاه أو يفسد به اختياره من غير أن تنعدم به الأهلية في حق المكره أو يسقط عنه الخطاب [3]

"اکراہ ایک ایسے فعل کا نام ہے جسے انسان دوسرے کی وجہ سے کرتا ہے جس کی وجہ سے مکرَہ کی رضامندی جاتی رہتی ہے یا اکراہ کی وجہ سے مکرَہ کی اہلیت ختم ہوئے اور اس سے خطاب ساقط ہوئے بغیر اس کا اختیار بے کار ہو جاتا ہے۔"

علامہ علاء الدین البخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حمل الغير على أمر يمتنع عنه بتخويف يقدر الحامل على إيقاعه ويصير الغير خائفاًبه فائت الرضا بالمباشرة[4]

"یعنی کسی شخص کو ایسے کام پر مجبور کرنا جو اس کام کو نہ کرنا چاہتا ہو، ایسے چیز سے ڈرا کر جو مجبور کرنے والا اس کام پر قادر ہو اور دوسرا شخص اس سے ڈرتا ہو اور اس کام کے کرنے پر راضی نہ ہو۔"

---

[3] السرخسي، شمس الأئمة محمد بن أحمد بن أبي سهل، **المبسوط**، (بیروت: دار المعرفة)، ۲۴: ۳۸

[4] البخاري، عبد العزيز بن أحمد بن محمد، علاء الدين، كشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي، (بیروت: دار الکتب العلمیہ، بیروت)، ۴: ۵۳۸

علامہ ابن الہام رحمہ لکھتے ہیں:

الإكراه اسم لفعل يفعله المرء بغيره فينتفي به رضاه أو يفسد به اختياره مع بقاء أهليته[5]

"اکراہ ایک ایسے فعل کانام ہے جسے انسان دوسرے کی وجہ سے کرتا ہے جس کی وجہ سے مکرَہ کی رضامندی جاتی رہتی ہے یا اس کی اہلیت کے رہتے ہوئے اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔"

شیخ علی حیدر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

الإكراه هو إجبار أحد على أن يعمل عملا بغير حق من دون رضاه[6]

"ناحق کسی شخص کو اس کی رضامندی کے بغیر کسی کام کے کرنے پر ڈرا کر مجبور کرنا۔"

مذکورہ بالا تعریفوں کا حاصل یہی ہے کہ ناحق کسی شخص کو اس کی رضامندی کے بغیر کسی کام کے کرنے پر ڈرا دھمکا کر مجبور کرنا اور اس کی اہلیت ختم ہوئے بغیر اس کے اختیار کا فاسد ہونا اکراہ ہے تاہم مذکورہ بالا تعریفات میں سب سے زیادہ جامع مانع تعریف علامہ سرخسی کی ذکر کردہ تعریف ہے۔

بیع میں اکراہ کے مسائل اور اس کی تفصیل کا سمجھنا چونکہ بیع کی حقیقت اور بیع میں تراضی کی شرط کے سمجھنے پر موقوف ہے، اس لیے اکراہ کے مسائل کو بیان کرنے سے پہلے بیع کی حقیقت اور بیع میں تراضی کی حقیقت کا ذکر کیا جائے گا۔

بیع کی لغوی تعریف:

لغت میں کسی ایک چیز کی دوسرے چیز سے تبادلہ کو "بیع" کہا جاتا ہے، چاہے مال کا تبادلہ مال سے ہو یا غیر مال سے، علامہ عبداللہ بن محمود الموصلی الحنفی نے بیع کی لغوی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

البيع في اللغة مطلق المبادلة وكذلك الشراء سواء كانت في مال او غيره[7]

"بیع لغت میں مطلق مبادلہ کو کہا جاتا ہے اسی طرح شراء بھی، خواہ یہ مبادلہ مال میں ہو یا مال کے علاوہ میں ہو۔"

---

[5] ابن الہام، محمد عبد الواحد بن عبد الحمید کمال الدین، **فتح القدیر**، (کوئٹہ: مکتبہ رشیدیہ)، ۹: ۲۳۸

[6] أفندي، علي حيدر خواجه أمين، **درر الحكام في شرح مجلة الأحكام**، (بيروت: دار الجيل)، ۲: ۶۵۸

[7] الموصلی، علامہ عبداللہ بن محمود الحنفی، الاختیار لتعلیل المختار، **کتاب البیوع**، (بیروت: دار الفکر)، ۲: ۳

در مختار میں ہے:

هو لغة مقابلة شيئ بشيئ مالا أولا[8]

"بیع لغت میں کسی چیز کا دوسرے چیز سے تبادلہ کو کہتے ہیں خواہ مال ہو یا مال نہ ہو۔"

معلوم ہوا کہ بیع کی لغوی حقیقت میں علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء مطلق تبادلہ کو لغۃ بیع کہتے ہیں چاہے مال کا مال کے ساتھ تبادلہ ہو یا غیر مال کے ساتھ، اور بعض علماء تبادلہ کو مال کے ساتھ خاص کرتے ہیں یعنی مبیع اور ثمن دونوں مال ہوں تو اسے لغوی اعتبار سے بیع کہا جائے گا، اگر غیر مال کا تبادلہ کیا جائے تو لغوی اعتبار سے اسے بیع نہیں کہا جائے گا۔

بیع کی شرعی حقیقت:

فقہ حنفی کی عام کتابوں مثلاً کنز، ہدایہ، درالملتقی اور مجمع الانھر میں بیع کی اصطلاحی تعریف "مبادلۃ المال بالمال" سے کی گئی ہے، البتہ علامہ علاء الدین حصکفیؒ اور علامہ کاسانیؒ اور دیگر فقہاء احناف نے بیع کی تعریف "مبادلۃ شیئ مرغوب فیه بمثله" سے کی ہے۔ علامہ سید احمد الطحطاوی الحنفیؒ اس تعریف پر نقض کرتے ہوئے صاحبِ کنز کی تعریف " مبادلۃ المال بالمال "کو اولیٰ قرار دیتے ہیں، اور نقض کچھ یوں کیا ہے کہ شراب مرغوب فیہ ہے لیکن اس کی بیع مسلم کے لیے ناجائز ہے حالانکہ مذکورہ تعریف کی رو سے شراب کی بیع جائز ہونی چاہئے، چنانچہ علامہ طحطاویؒ لکھتے ہیں:

ویرد علی هذا التعریف بیع الخمر من متعاطیه من مسلم وقد صرح فی المحیط انه لیس بمال وانه لا ینعقد علیه العقد[9]

اور صاحبِ کنز کی تعریف کو راجح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

فالاولی ما ذکره حافظ الدین فی الکنز من قوله : هو مبادلۃ المال بالمال بالتراضی[10]

---

[8] الحصکفي، محمد بن علي بن محمد علاء الدین الحنفي، الدر المختار، کتاب البیوع، (بیروت: دار الکتب العلمیۃ)۴: ۵۰۱

[9] الطحطاوی، العلامہ سید احمد، حاشیۃ الطحطاوی علی الدر، کتاب البیوع، (کوئٹہ: المکتبۃ الرشیدیۃ)، ۳: ۳

[10] ایضاً

اسی وجہ سے علامہ شامیؒ نے در مختار کی مذکورہ عبارت کے تحت یہ صراحت کر دی ہے کہ اس سے بھی مال ہی مراد ہے اور اس سے بھی وہی تعریف مراد ہے جو صاحبِ کنز اور صاحبِ ملتقی نے کی ہے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

(قوله: مرغوب فيه) أي ما من شأنه أن ترغب إليه النفس وهو المال ولذا احترز به الشارح عن التراب والميتة والدم فإنها ليست بمال فرجع إلى قول الكنز والملتقى مبادلة المال بالمال.[11]

"یعنی مرغوب فیہ سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور وہ مال ہے، اسی وجہ سے شارح نے مٹی، مردار اور خون سے احتراز کیا ہے، اس لیے کہ یہ مال نہیں ہے، لہذا کنز اور ملتقی کی تعریف "مبادلۃ المال بالمال" کو اولیٰ قرار دیا اور اسے پسند کیا۔"

بیع میں تراضی کی قید کی حقیقت:

بعض فقہاء کرام کے نے "مبادلۃ المال بالمال" کو شرعاً بیع قرار دیا ہے، صاحبِ در المنتقی اور صاحبِ مجمع الانھر کی یہی رائے ہے کہ بیع کی تعریف میں تراضی کی قید ضروری نہیں، چنانچہ صاحبِ در المنتقی نے لکھا ہے:

وشرعا مبادلۃ مال ای تملیث المال کما فی الدرایۃ بمال[12]

"مال کے ذریعہ مال کی تملیک کو شرعاً بیع کہا جاتا ہے۔"

اسی طرح مجمع الانھر میں ہے:

البيع في الشرع مبادلة مال بمال لم يقل بالتراضي ليتناول بيع المكره فإنه منعقد وإن لم يلزم.[13]

"مال کا مال سے تبادلہ کو شرعاً بیع کہتے ہیں، تراضی کی قید کا نہ ہونا اس لیے ہے تاکہ یہ تعریف مکرہ کی بیع کو بھی شامل ہو، مکرَہ کی بیع منعقد ہو جاتی ہے اگرچہ لازم نہیں ہوتی۔"

مگر فتح القدیر، کفایہ، عنایہ اور کنز میں بیع کی تعریف میں "مبادلۃ المال بالمال" کے ساتھ "التراضی" کی قید بھی لگائی ہے، چنانچہ صاحبِ عنایہ نے بیع کی تعریف اس طرح کی ہے:

---

[11] ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز الدمشقي الحنفي، رد المحتار على الدر المختار، **كتاب البيوع**، (بيروت: دار الفكر)، ۴: ۵۰۲

[12] الحصكفي، محمد بن علي بن محمد علاء الدين الحنفي، در المنتقی علی هامش مجمع الانهر، **كتاب البيوع**، (کوئٹہ: مكتبة المنار)، ۲: ۳

[13] عبد الرحمن بن محمد بن سليمان الكليبولي المدعو بشيخي زاده، مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر، (بيروت: دار الكتب العلمية)، ۳: ۴

والبيع في اللغة تمليك المال بالمال وزيد عليه في الشرع فقيل هو مبادلة المال بالمال بالتراضي بطريق الاكتساب.[14]

"بیع لغت میں تملیک المال بالمال کا نام ہے اور شریعت میں اس پر اضافہ کر کے کہا گیا ہے کہ رضامندی کے ساتھ اکتساب کے طور مال کا تبادلہ مال کے ذریعہ بیع ہے۔"

صاحبِ کفایہ نے بیع کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

البیع مبادلۃ المال بالمال بالتراضی[15]

محقق ابن الہامؒ لکھتے ہیں:

والذي يظهر أن التراضي لا بد منه لغة أيضا فإنه لا يفهم من باعه وباع زيد عبده إلا أنه استبدل به بالتراضي ، وأن الأخذ غصبا وإعطاء شيء آخر من غير تراض لا يقول فيه أهل اللغة باعه.[16]

ترجمہ: لغت کے اعتبار سے بھی بیع کی تعریف میں تراضی کی قید ملحوظ ہے، کیونکہ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ زید نے اپنا غلام فروخت کیا تو لغت اور عرف کے اعتبار سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے اپنی رضامندی سے غلام کا ثمن سے تبادلہ کیا ہے، غصب کے ذریعہ کسی کے مال کو لینے اور کسی شخص کو اس کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز دینے کو اہل لغت "بیع" سے تعبیر نہیں کرتے۔

علامہ الزیلعیؒ بھی تراضی کی قید کو ضروری سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بیع کا تراضی کی قید کے ساتھ مقید ہونا خود قرآن کریم سے ثابت ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ[17]

---

[14] العینی، أبو محمد محمود بن أحمد بن موسی بن أحمد بن حسین الغیتابی الحنفی، البنایۃ، **کتاب البیوع**، (بیروت: دار الکتب العلمیۃ)، ۸: ۳۶۸

[15] محمود بن عبید اللہ ابن تاج الشریعۃ، الکفایۃ، علی ہامش فتح القدیر، **کتاب البیوع**، (کوئٹہ: المکتبۃ الرشیدیۃ،)، ۶: ۴۹

[16] ابن الہام، ھو محمد عبد الواحد بن عبد الحمید کمال الدین، فتح القدیر، **کتاب البیوع**، ۱۴: ۱۷۴

[17] **النساء: ۲۹**

" اے ایمان والوں! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ الا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو۔"

چنانچہ علامہ زیلعیؒ صاحبِ کنز کی عبارت " مبادلة المال بالمال بالتراضی " کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

وهذا في الشرع وفي اللغة هو مطلق المبادلة من غير تقييد بالتراضي وكونه مقيدا به ثبت شرعا لقوله تعالى "الا ان تكون تجارة عن تراض".[18]

مذکورہ بالا تشریح سے واضح ہوا کہ بیع میں تراضی کی قید ضروری ہے، جس سے مکرَہ کی بیع خارج ہو جاتی ہے، لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ مکرَہ کی بیع باطل نہیں ہوتی بلکہ فاسد ہوتی ہے اور مبیع پر قبضہ کر لینے کے بعد مشتری کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، اسی لیے علامہ شامیؒ نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

فلا يناسب ذكر التراضي في التعريف[19]

"تعریف کے اندر تراضی کا ذکر مناسب نہیں۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ بیع کے صحیح اور نافذ ہونے کے لیے عاقدین کی رضامندی شرط اور ضروری ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ[20]

" اے ایمان والوں! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ الا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو۔"

اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

إنما البيع عن تراض[21]

---

[18] الزیلعي فخر الدین، عثمان بن علي بن محجن البارعي، الحنفي، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، **کتاب البیوع**، (القاہرۃ: المطبعة الکبری)، ۴: ۲

[19] ابن عابدین، محمد أمین بن عمر بن عبد العزیز الدمشقي الحنفي، **رد المحتار علی الدر المختار**، **کتاب البیوع**، ۴: ۵۰۳

[20] النساء: ۲۹

[21] القزوینی، ابو عبد اللہ محمد بن یزید، سنن ابن ماجه، باب بیع الخمر، **کتاب التجارات**، (بیروت: دار الفکر)، ۲: ۷۳۷

"بیع فریقین کی رضامندی سے وجود میں آتی ہے۔"

دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

عن النبي صلى الله عليه و سلم قال لا يتفرقن عن بيع إلا عن تراض [22]

"آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فریقین آپس کی رضامندی کے بغیر جدا نہ ہو۔"

چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی فقہ البیوع میں فرماتے ہیں:

ويجب لجواز البيع تراضي المتعاقدين لقوله تعالى: يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم. [23]

"بیع کے جائز ہونے کے لیے دونوں فریقوں کا راضی ہونا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کی وجہ: اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ الا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو۔"

قرآن وسنت کے ارشادات سے یہی واضح ہوتا ہے کہ شرعاوہی بیع معتبر اور قابلِ نفاذ ہے جو فریقین کی باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو، کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف زبردستی بیع پر مجبور کرنا جائز نہیں۔

اکراہ کی بناءپر عقد فاسد اور عام بیوعِ فاسدہ میں فرق:

اکراہ کی صورت میں اگر بائع کو ثمن لینے پر مجبور کیا جائے تو اس سے عقد لازم نہیں ہوتا بلکہ بائع کا اس ثمن کو مشتری پر لوٹانا ضروری ہے، کیونکہ اکراہ کی وجہ سے یہ عقد فاسد ہے، لیکن اکراہ کی بناءپر عقدِ فاسد اور عام بیوعِ فاسدہ میں چار اعتبار سے فرق ہے:

1۔ اکراہ کی صورت میں عقدِ فاسد، قولی یا فعلی اجازت سے درست ہو جاتی ہے، جبکہ عام بیع فاسد میں اجازت کے باوجود وہ بیع درست نہیں ہو گی بلکہ اس کا توڑنا ہی واجب ہے۔

---

[22] الترمذي، محمد بن عيسى أبو عيسى السلمي، **سنن الترمذي، كتاب البيوع**، (بیروت: دار إحياء التراث العربي)، ۳: ۵۵۱

[23] عثمانی، محمد تقی، فقہ البیوع. (کراچی: ادارۃ المعارف، ۲۰۱۳ء)، ۱: ۱۹۵

2۔ اکراہ کی صورت میں اگر مشتری نے مبیع میں تصرفات کیے ہوں مثلا ان کو آگے بیچ دیا ہو تو ان سب تصرفات کو ختم کیا جائے گا اگرچہ مبیع کی کئی ہاتھوں میں چلی گئی ہو، جبکہ عام بیع فاسد میں اگر مشتری مبیع آگے کسی شخص کو بیچ دے تو اس کو برقرار رکھا جائے گا، ختم نہیں کیا جائے گا۔

3۔ اگر مبیع غلام ہو اور مشتری نے اس کو آزاد کر دیا تو اکراہ کی صورت میں اس کی اعتاق کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہو گا جبکہ عام بیع فاسد میں قبضہ کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہو گا۔

4۔ مکرَہ کے قبضہ میں ثمن امانت ہوتی ہے اور بلاتعدی ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر ضمان نہیں آئے گا، جبکہ عام بیوع فاسدہ میں ثمن بائع کے قبضہ میں ضمانت ہوتی ہے اور ہلاکت کی صورت میں وہ ضامن ہو گا۔ الدر المختار میں ہے:

وإن (قبض) الثمن مكرها لا يلزم ورده ولم يضمن إن هلك الثمن لأنه أمانة درر إن بقي في يده لفساد العقد لكنه يخالف البيع الفاسد في أربع صور يجوز بالإجازة القولية والفعلية و الثاني أنه ينقض تصرف المشتري منه وإن تداولته الأيدي والثالث: تعتبر القيمة وقت الإعتاق دون وقت القبض و الرابع: الثمن والمثمن أمانة في يد المكره لأخذه بإذن المشتري فلا ضمان بلا تعد بخلافها في الفاسد بزازية.[24]

بیع بالاکراہ میں زیادتی متصلہ ومنفصلہ کے ضمان کا حکم:

بیع بالاکراہ چونکہ بیع فاسد کے حکم میں ہوتی ہے اور مکرَہ کو اس بیع کے فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، یہ اختیار کسی بھی صورت میں ختم نہیں ہوتا، لہذا اس صورت میں اگر مبیع میں کوئی زیادتی پیدا ہو جائے، خواہ زیادتی متصلہ ہو یا منفصلہ، بہرصورت اس کو فسخ کا اختیار رہے گا، زیادتی کے ساتھ اس کو واپس مالک پر لوٹایا جائے گا، البتہ اگر زیادتی متولدہ نہ ہو بلکہ غیر متولدہ ہو مثلا کپڑا تھا اس نے سی لیا تو ایسی صورت میں مشتری کی رضامندی کے بغیر بائعِ مکرَہ کو فسخ کا اختیار نہیں ہو گا۔ فتاویٰ شامیہ میں ہے:

(قوله ولا بالزيادة المنفصلة) سواء كانت متولدة كالثمرة أو لا كالأرش وكذا المتصلة المتولدة كالسمن وأما غير المتولدة كصبغ وخياطة ولت سويق فتمنع الاسترداد إلا برضا المشتري كذا ذكروا في البيع الفاسد.[25]

---

[24] الحصكفي، محمد بن علي بن محمد الحِصْني المعروف بعلاء الدين الحنفي، **الدر المختار، كتاب الاكراه**،٦: ١٣١

[25] ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي، **رد المحتار على الدر المختار، كتاب الاكراه**،٦: ١٣٠

بیع بالاکراہ کی صورت میں عاقدین کی موت کے باوجود حق فسخ کا ثبوت:

اکراہ کی صورت میں چونکہ مکرَہ کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، مکرَہ خواہ بائع ہو یا مشتری اور یہ اختیار ان میں سے کسی کے مرنے سے بھی ختم نہیں ہوتا بلکہ عاقدین میں سے ہر ایک کے ورثاء اپنے اپنے مورث کے قائم مقام ہوں گے۔

(فلو أكره بقتل أو ضرب شديد) متلف لا بسوط أو سوطين فسخ) ما عقد ولا يبطل حق الفسخ بموت أحدهما ولا بموت المشتري وفي الشامية أي المكره والمكره فيقوم ورثة كل مقامه كورثة المشتري.[26]

حق الاجازہ اور اس کی اقسام:

احناف رحمہم اللہ کے نزدیک اکراہ کی وجہ سے کی گئی بیع مکرَہ کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے، اکراہ کے زائل ہونے کے بعد مکرَہ کو بیع کو جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہوتا ہے، اس لیے یہاں اکراہ کے زائل ہونے کے بعد مکرَہ کا بیع کو جاری رکھنے اور اس کی اجازت دینے کی تفصیل ذکر کی جائے گی۔ اکراہ زائل ہو جانے کے بعد مکرَہ کو حالتِ اکراہ میں کی گئی بیع کو جاری رکھنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے، اور اگر مشتری نے اس میں تصرفات کیے ہوں تو بائع مکرَہ اس کے تصرفات کو جاری رکھ کر سکتا ہے، اس کو حق الاجازۃ کہا جاتا ہے، اجازت کی دو قسمیں ہیں: اجازتِ قولی اور اجازتِ فعلی۔

اجازتِ قولی:

اجازتِ قولی یہ ہے کہ اکراہ کے زائل ہونے کے بعد مکرَہ اپنے قول سے یہ کہے کہ میں نے اس بیع کو برقرار رکھا ہے یا میں اس بیع کو فسخ نہیں کرنا چاہتا یا یہ کہے کہ میں نے اس بیع کی اجازت دی۔ اجازتِ قولی کے بعد اس کو بیع فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا، لہذا اس کے بعد اگر مکرَہ نے دوبارہ اس بیع کو ختم کرنا چاہا تو اس کو اس کا حق نہیں کیونکہ اس نے اپنے اختیار سے اپنا حق ساقط کر دیا۔

---

[26] ایضاً

اجازت فعلی:

اجازتِ فعلی یہ ہے کہ مکرَہ کی جانب سے کوئی بھی ایسا فعل صادر ہو جائے جو حالتِ اکراہ میں کئے گئے تصرفات کو برقرار رکھنے اور فسخ نہ کرنے پر دلالت کرے، مثلاً اکراہ زائل ہونے کے بعد بائع مکرَہ نے مشتری سے بخوشی ثمن لے لیاتو یہ اس کی طرف سے اجازت ہو گی، کیونکہ ثمن پر اپنے اختیار سے قبضہ کر لینا رضامندی کی دلیل ہے، لہٰذا اس کے بعد مکرَہ کو بیع فسخ کرنے کا اختیار نہیں۔ درر الحکام میں ہے:

الإجازة نوعان:النوع الأول: الإجازة قولا وصراحة كقول المكره أجزت البيع المذكور أو أعطيت إجازة به النوع الثاني: الإجازة الفعلية فلو قبض البائع المكره طائعا ثمن المبيع أو سلم المبيع للمشتري طائعا نفذ البيع المذكورلأن الإكراه على البيع لا يستلزم الإكراه على تسليم المبيع ولأن الاستحقاق في البيع يثبت بنفس العقد فلم يكن التسليم فيه داخلا في الإكراه.[27]

حقِ فسخ اور استرداد:

احنافؒ کے نزدیک حالت اکراہ میں کی گئی بیع کو اکراہ کے زائل ہونے کے بعد چونکہ مکرہ ختم بھی کر سکتاہے اور اگر مشتری نے اس میں تصرفات کیے ہوں تو ان تصرفات کو ختم کر کے اپنی چیز واپس لے سکتاہے، اس کو حق فسخ اور حقِ استرداد کہاجاتاہے۔ مکرَہ کے لیے حقِ فسخ ان کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتاہے اور ان کے ورثاء بیع کو فسخ کرنے میں ان کا قائم مقام ہونگے، اسی طرح اگر مبیع میں کوئی ایسی زیادتی ہو جائے جو اس سے علیحدہ ہو سکتی ہو مثلا گائے جب وہ بچہ جنے یا وہ زیادتی اس مبیع کے ساتھ متصل ہو، ان دونوں صورتوں میں بھی مکرَہ کو حقِ فسخ حاصل ہوتاہے، چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں: ولا يبطل حق الفسخ بموت أحدهما ولا بموت المشتري ولا بالزيادة المنفصلة.[28] اور اگر مشتری نے مبیع میں تصرف کیاہو تو اس میں دیکھاجائے گا کہ اگر وہ تصرفات قابلِ فسخ ہوں مثلا اس نے مبیع کو آگے بیچ دیایا اس کو صدقہ کر لیاتو ان صورتوں میں ان تصرفات کو ختم کیاجائے گا اور اس چیز کو واپس مکرَہ کو دلایا جائے گا، اور اگر وہ تصرفات ناقابلِ فسخ ہو مثلا مبیع غلام تھا اور مشتری نے اس کو آزاد کیا تو ایسی صورت میں مکرَہ کو حقِ فسخ نہیں ملے گا بلکہ وہ مشتری سے اس کا ضمان لے سکتاہے۔

---

[27] أفندي، علي حيدر خواجه أمين، درر الحكام في شرح مجلة الأحكام، ۲: ۳٦۷

[28] الحصكفي، محمد بن علي بن محمد، الدر المختار، كتاب الاكراه، ٦: ۱۳۰

چنانچہ ڈاکٹر محمد محمود لکھتے ہیں:

أما الحنفية فقد فرقوا في نوع التصرف فقالوا إذا تصرف المشتري بالعين تصرفاً لايقبل الفسخ فلاحق للمكرَه بالنقض والاسترداد بل ينتقل حقه الى المطالبة بالضمان وعلى اعتبار العين بحكم الهالكة أما اذا تصرف بها تصرفاً يقبل الفسخ بعد قبضها من المكرَه، فلا يبطل حقه في استردادها حتى لو تداولتها الأيدي فلو باع المشتري العين من آخر وباعها الثاني من الثالث وباعها ثالث من غيره وهكذا فللمكرَه ان يفسخ العقود كلها.[29]

عین ہلاک ہونے کی صورت میں ضمان کا حکم:

عام حالات میں مکرَہ کو حالت اکراہ میں کی گئی بیع کو فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے لیکن بسا اوقات بیع فسخ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، یا تو مبیع ہلاک ہونے کی وجہ سے یا مشتری نے ایسا تصرف کیا ہوا ہوتا ہے جس کو فسخ کرنا ممکن نہیں ہوتا مثلاً مبیع غلام تھا اور اس نے اس غلام کو آزاد کیا، تو ایسی صورت میں مکرَہ کو حقِ فسخ کے بجائے عین کا ضمان لینے کا حق ہوتا ہے، ایسی صورت میں مکرَہ چاہے مکرِہ سے ضمان لے لے یا مشتری سے لے لے۔ اگر مکرَہ نے ضمان مکرِہ سے لیا تو اس صورت میں مکرِہ اس کی قیمت کا مشتری سے رجوع کرے گا، اس لیے کہ جب مکرِہ نے اس کا ضمان ادا کر لیا تو اس چیز کا مالک ہو گیا، اس لیے مکرِہ کو مشتری سے قیمت کا ضمان لینے کا حق ہے، لیکن اگر مکرَہ نے ضمان مشتری سے لے لیا تو مشتری اس کا ضمان مکرِہ سے نہیں لے سکتا۔

اگر مبیع میں تصرفات ہو گئے ہوں مثلاً اس کو کئی لوگوں نے ایک دوسرے سے خریدا ہوں تو ایسی صورت میں مکرَہ کو اختیار ہے کہ جس مشتری سے چاہے ضمان لے سکتا ہے، اگر مکرَہ نے مشتری اول سے ضمان لیا تو بقیہ سارے تصرفات درست ہو جائیں گے، کیونکہ جب بیع اول صحیح ہو گئی تو گویا اس نے اپنی ملکیت بیچ دی، لیکن اگر مکرَہ نے مشتری دوم یا سوم کو ضامن بنایا تو اس صورت میں اس سے پہلے والے تصرفات درست نہیں ہونگے اور بعد والے درست ہو جائیں گے، اس لیے کہ فساد کی صورت میں قبضہ کے وقت ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، اس سے پہلے نہیں، لہذا اس صورت میں بھی جس کو ضامن بنایا ہے اس کی ملکیت ثابت ہو گئی تو گویا کہ اس نے اپنی چیز بیچ دی جس کی وجہ سے اس کے بعد والوں کی بھی تصرف اور ملکیت ثابت ہو گئی، لیکن اس سے پہلے والوں کی ملکیت اس کی وجہ سے ثابت نہیں ہوئی۔

---

[29] محمود احمد، اثر الاکراہ فی المعاملات المالیۃ، نسخۃ، ١٩

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

والبائع المكره له أن يضمن أيا شاءمن المكره بالكسر والمشتري فإن ضمن المكره رجع على المشتري بقيمته وإن ضمن المشتري نفذ يعني جاز لما مر كل شراء بعده ولا ينفذ ما قبله لو ضمن المشتري الثاني مثلا لصيرورته ملكه فيجوز ما بعده لا ما قبله فيرجع المشتري الضامن بالثمن على بائع.[30]

اس کی تشریح علامہ ابن عابدینؒ تحریر فرماتے ہیں:

(قوله:له أن يضمن أيا شاء)لأن المكره كالغاصب والمشتري كغاصب الغاصب وإن ضمن المشتري لا يرجع على المكره زيلعي. (قوله: رجع على المشتري بقيمته) لأنه بأداء الضمان ملكه فقام مقام المالك المكره فيكون مالكا من وقت وجوب السبب بالاستناد زيلعي (قوله يعني جاز) المراد هنا بالجواز الصحة لا الحل كما لا يخفى فافهم. (قوله لما مر) من أنه نافذ قبل الإجازة والموقوف عليها اللزوم بمعنى الصحة بناء على ما في شرح الطحاوي وقد مر الكلام فيه (قوله: كل شراء بعده) أي لو تعدد الشراء وكذا نفذ شراء المشتري من المكره وهذه مسألة ذكرها الزيلعي مستقلة موضوعها لو تداولته الأيدي وما قبلها موضوعها في مشتر واحد جمعهما المصنف في كلام واحد اختصارا(قوله: لو ضمن المشتري الثاني مثلا) أفاد بقوله مثلا أن له أن يضمن أيا شاء من المشترين فأيهم ضمنه ملكه كما في التبيين.[31]

مکرِہ کے وکیل سے ضمان لینے کا حکم:

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ مکرَہ کو اختیار ہے کہ مکرِہ اور مشتری میں سے جس کو چاہے ضامن بنالے، لیکن اگر مکرِہ نے اکراہ کے لیے اپنا کوئی وکیل مقرر کیا ہو کہ وہ کسی کو اپنی چیز بیچنے پر مجبور کرے، تو کیا ایسی صورت میں مکرِہ کے وکیل سے ضمان لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مکرِہ نے اپنے وکیل کو اکراہ ملجی کے ساتھ مجبور کیا ہو کہ وہ دوسرے کو اپنی چیز بیچنے پر مجبور کرے تو ایسی صورت میں مکرَہ، مکرِہ کے وکیل کو ضامن نہیں بناسکتا، اس لیے کہ اکراہ ملجی کی وجہ سے اس کے فعل کا کوئی اعتبار نہیں رہا، تو گویا وکیل محض مکرِہ کا آلہ ہے، اس لیے وکیل سے ضمان نہیں لیا جاسکتا۔ اور اگر مکرِہ نے اکراہ غیر ملجی کے ساتھ وکیل کو مجبور کیا ہو اور اس نے ایسی حالت میں بائع کو اپنی چیز بیچنے پر مجبور کیا تو اس صورت میں مکرَہ وکیل سے بھی ضمان لے سکتا ہے، اس لیے کہ اکراہ غیر ملجی مباشر کے فعل کو غیر معتبر قرار دینے میں مؤثر نہیں، اس لیے مکرَہ، مکرِہ کے وکیل سے بھی ضمان لے سکتا ہے۔

---

[30] الحصكفي، محمد بن علي بن محمد، **الدر المختار، كتاب الاكراه**، ٦: ١٣٣

[31] ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي، **رد المحتار على الدر المختار، كتاب الاكراه**، ٦: ١٣٣

المبسوط للسرخسی میں ہے:

ولو أكرهه على أن وكله ببيع عبده من هذا بألف درهم وأكرهه على دفعه إليه حتى يبيعه ففعل ذلك فباعه الوكيل وأخذ الثمن ودفع العبد إلى المشتري فهلك العبد في يده من غير فعله والوكيل والمشتري غير مكرهين فالمولى بالخيار إن شاء ضمن المشتري قيمة عبده لأنه قبضه طائعا بشراء فاسدوإن شاء ضمن الوكيل لأنه متعد في البيع والتسليم طائعاوإن شاء ضمن متملكا على المكره حتى لو أعتقه نفذ عتقه فلا يمكن أن يجعل متملكا بهذا السبب على الوكيل ...ولو كان المولى والوكيل مكرهين بالقتل فإن المولى بالخيار إن شاء ضمن المشتري قيمة عبده لأنه قبضه بشراء فاسد طائعا وإن شاء ضمن المكره بإكراهه إياه على التسليم بوعيد تلف ثم يرجع بها المكره على المشتري لأنه قائم مقام من ضمن ولأنه ملكه بالضمان ولا ضمان له على الوكيل لأنه كان مكرها بالقتل على القبض والتسليم فلا يبقى في جانبه فعل معتبر.[32]

عین میں نقصان ہونے پر ضمان کا حکم:

جبری بیع میں اگر عین میں کوئی نقصان آجائے، تو اس کا حکم غصب کی طرح ہے، اس صورت میں نقصان اگر مبیع کا کوئی حصہ ہلاک ہونے کی وجہ سے یا اس میں کوئی عیب آنے کی وجہ سے آیا ہو تو عین کو مالک پر لوٹایا جائے گا اور جتنا نقصان ہوا ہے اس کا تاوان مالک کو دیا جائے گا، اور اگر نقصان اس چیز کی قیمت گرنے کی وجہ سے ہو تو اس صورت میں اس کا کائی ضمان واجب نہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر محمد محمود لکھتے ہیں:

إذا حصل زيادة أو نقص في العين فحكمه حكم الغصب.ففي حال النقص إن كان هذا النقص بسبب فوت جزء من المبيع أو حصول عيب به يرد العين الى مالكها وارش ما نقص منها اتفاقاً...وإن كان النقص بسبب تراجع الاسعار فلا ضمان عليه لأن تراجع الاسعار يكون نتيجة فتور الرغبات في السلع دون فوت الجزءهذا متفق عليه بين الفقهاء.[33]

مشتری کے پاس مبیع ہلاک ہو جائے:

اگر کسی شخص نے اکراہ کی وجہ سے اپنی چیز بیچ دی، اور مشتری نے اس پر قبضہ کر لیا جبکہ مشتری خریدنے پر مجبور نہیں تھا اور وہ چیز مشتری کے پاس ہلاک ہوگئی تو اس چیز کی قیمت مشتری پر لازم ہے، اس لیے کہ بیع مکرَہ بیع

[32] السرخسی، شمس الائمۃ محمد بن أحمد بن أبي سھل، **المبسوط، کتاب الاکراہ**، باب الاکراہ فی الوکالۃ، ۲۴: ۱۴۷

[33] محمود احمد، **اثر الاکراہ فی المعاملات المالیۃ**، نسخۃ، ۲۳

فاسد کے حکم میں ہے اور مشتری نے مبیع پر قبضہ اپنے اختیار سے کیا تھا،لہذا مبیع مضمون بالقیمہ ہے، لیکن اگر مشتری بھی خریدنے پر مجبور تھاتو اس صورت میں مبیع اس کے قبضہ میں امانت ہو گی،لہذا اگر بغیر تعدی کے ہلاک ہو جائے تو اس پر کوئی ضمان نہیں اور اگر تعدی کی وجہ سے ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان واجب ہو گا۔

البحر الرائق میں ہے:

(وإن هلك المبيع في يد المشتري وهو غير مكره والبائع مكره ضمن قيمته للبائع) لأنه قبضه بحكم عقد فاسد فكان مضمونا عليه بالقيمة قيد بقوله والمشتري غير مكره قال قاضي خان ولو كان المشتري مكرها دون البائع فهلك المشتري عنده من غير تعد منه يهلك أمانة.[34]

ضمان لینے میں قیمتوں کا اعتبار:

اگر مشتری نے حالتِ اکراہ میں خریدی ہوئی چیز میں کوئی ایسا تصرف کیا جو ناقابلِ فسخ ہو یا وہ چیز ہلاک ہو جائے تو اس صورت میں چونکہ مکرَہ کو مکرِہ اور مشتری میں سے جس سے چاہے ضمان لینے کا حق حاصل ہوتا ہے، لیکن ضمان میں کس وقت کی قیمت کا اعتبار ہو گا اس کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ اگر ہلاک شدہ مبیع مثلیات میں سے ہو تو اس صورت میں ضمان میں مثلی چیز ہی لی جائے گی، لیکن اگر مبیع قیمیات میں سے ہو تو اس صورت میں اگر مکرَہ نے مکرِہ کو ضامن قرار دیا تو اس سے وقت التسلیم (جس وقت بائع مکرَہ نے مبیع کو مکرِہ کے حوالہ کیا) کی قیمت لی جائے گی، اور اگر مشتری کو ضامن قرار دیا تو اس صورت میں مکرَہ کو اختیار ہے چاہے اس سے یوم القبض کی قیمت (یعنی جس دن مشتری نے وہ چیز خرید کر اس پر قبضہ کر لیا تھا) لے لے یا اس دن کی قیمت لے لے جس دن وہ چیز ناقبلِ فسخ ہو گئی تھی (مثلا اس نے خریدے ہوئے غلام کو آزاد کیا یا جس دن وہ مبیع ہلاک ہو گئی، اگر یوم القبض اور یوم الہلاک کی قیمتوں میں تفاوت ہو تو جس دن کی قیمت زیادہ ہو اس کو اختیار کر سکتا ہے۔

چنانچہ شیخ علی حیدرؒ درر الحکام میں فرماتے ہیں:

إذا تصرف مشتري المال المبيع فيه لا يمكن معه نقض البيع وفسخه فالمالك مخير إن شاء ضمن المجبر، يعني إذا كان المبيع من المثليات يأخذ مثله وإذا كان من القيميات يأخذ قيمته وقت تسليمه وإن شاء ضمن المشتري وإذا اختار تضمين المشتري فيه أن يضمنه قيمته يوم قبضه إياه وله أن

---

[34] ابن نجیم زین الدین بن إبراهیم بن محمد، البحر الرائق، کتاب الاکراہ، هلك المبيع في يد المشتري وهو غير مكره والبائع مكره، (بیروت: دار الکتاب الإسلامي)، ۸: ۸۲

يضمنه قيمته وقت إحداثه الحال الغير قابل للنقض لأنه قد أفسد على المال بهذا الإحداث حق استرداده. وفي كون المكره مخيرا في التضمين نظر له حيث يختار لأكثر عند التفاوت.[35]

ان چند اصولی باتوں کو ذکر کرنے کے بعد اکراہ سے متعلق مسائل ذکر کیے جائیں گے۔

اپنی چیز فروخت کرنے پر اکراہ:

جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ شریعت مطہرہ نے بیع کے صحیح اور درست ہونے کے لیے عاقدین کی رضامندی اور طیبِ نفس کو ضروری قرار دیا ہے، لہذا اگر کسی عقد میں بائع کی رضامندی مفقود ہو اور جبر و اکراہ سے بائع کو مجبور کر کے بیع کی گئی ہو تو اس پر سارے فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ بیع صحیح نہیں، اس لیے کہ اکراہ کی حالت میں مکرَہ کی رضامندی نہیں ہوتی جبکہ بیع کے لیے بائع کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے:

لا يركبن البحر إلا حاج أو معتمر أو غازى فى سبيل الله فإن تحت البحر نار ا و تحت النار بحرا ولا تشترى من ذى ضغطة سلطان شيئا[36]

"سمندر میں حاجی، عمرہ کرنے والا اور مجاہد کے علاوہ کوئی سفر نہ کرے کیونکہ سمندر کے نیچے آگ یا آگ کے نیچے سمندر ہے اور بادشاہ کی طرف سے مجبور شخص سے کوئی چیز نہ خریدی جائے۔"

اسی لیے تمام فقہاء کرامؒ اس بات پر متفق ہیں کہ مکرَہ کی بیع جائز نہیں، خواہ اکراہ ملجی ہو یا غیر ملجی، مکرَہ کی بیع کی عدمِ جواز کے بارے میں اکراہ ملجی اور غیر ملجی دونوں برابر ہے۔

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

لأن الإكراه الملجئ وغير الملجئ يعدمان الرضا والرضا شرط لصحة هذه العقود[37]

حضرات احناف رحمہم اللہ کے نزدیک مکرَہ کی بیع، بیع فاسد موقوف میں داخل ہے، فاسد اس لیے ہے کہ اس میں بائع کی رضامندی نہیں پائی جارہی جو کہ شرطِ صحتِ بیع ہے۔ حنفیہ کے نزدیک چونکہ مکرَہ کی بیع فاسد ہے، باطل نہیں، اس لیے اگر مشتری نے مبیع پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا اور اس کے وہ سارے تصرفات نافذ

---

[35] أفندي، علي حيدر خواجه أمين، درر الحكام في شرح مجلة الأحكام، ۲: ۷۳۷

[36] السيوطي، جلال الدين، جامع الأحاديث، مؤسسة الرسالة ،۱۷: ۱۲۶

[37] الحصكفي، محمد بن علي بن محمد، الدر المختار، كتاب البيوع، ۶: ۱۳۰

ہو جائیں گے جو ناقابلِ فسخ ہیں جیسے اعتاق، تدبیر وغیرہ، لیکن وہ تصرفات جو قابلِ فسخ ہیں جیسے بیع، ہبہ اور صدقہ و غیرہ، تو وہ نافذ نہیں ہوں گے اور مکرَہ کی بیع کے موقوف ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ اکراہ کے ختم ہو جانے کے بعد مکرَہ کی اجازت سے وہ بیع نافذ ہو جائے گی، خواہ اجازت قولی ہو یا فعلی۔

چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

وأفاد في المنار وشرحه أنه ينعقد فاسدا لعدم الرضا الذي هو شرط النفاذوأنه بالإجازة يصح ويزول الفساد وبه علم أن الموقوف على الإجازة صحته فصح كونه فاسدا موقوفا وظهر أن الموقوف منه فاسد كبيع المكره ومنه صحيح كبيع عبد أو صبي محجورين.[38]

اسی طرح علامہ شامی کتاب الاکراہ میں تحریر فرماتے ہیں:

و حينئذ يملكه المشتري إن قبض فيصح إعتاقه وكذا كل تصرف لا يمكن نقضه قوله وكذا كل تصرف لا يمكن نقضه كالتدبير والاستيلاد والطلاق فلا يصح بيعه وهبته وتصدقه ونحوها مما يمكن نقضه قهستاني.[39]

لیکن یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ بائع مکرَہ کو اختیار اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کو بیع اور مبیع کے حوالہ کرنے پر یا ثمن کے قبضہ کرنے پر مجبور کیا جائے ،اگر اس کو صرف بیع پر مجبور کیا گیا مگر مبیع کے حوالہ کرنے پر مجبور نہیں کیا، اس صورت میں اگر بائع نے مبیع مشتری کو دے دی تو یہ بیع لازم ہو جائے گی اور بائع کو اختیار نہیں ہو گا، اس لیے کہ بائع کو تو صرف بیع پر مجبور کیا گیا تھا اور اس نے مشتری کو قبضہ اپنے اختیار سے کرایا ہے اس لیے یہ بیع لازم ہو گئی اور اس کو اختیار نہیں ملے گا۔

درر الحکام شرح غرر الاحکام میں ہے:

فإن قبض أي البائع المكره الثمن أو سلم المبيع طوعا قيد للمذكورين نفذ البيع لوجود الرضا وإن قبضه الثمن مكرها لا أي لا ينفذ لعدم الرضا ورده أي رد البائع الثمن الذي قبضه مكرها إن بقي في يده ولم يضمن إن هلك لأن الثمن كان أمانة عند المكره لأنه أخذ بإذن المشتري والقبض إذا

[38] ابن عابدین، محمد أمین بن عمر بن عبد العزیز الدمشقي الحنفي، **رد المحتار علی الدر المختار، کتاب البیوع**،۴: ۵۰۳

[39] ایضا، **کتاب الاکراہ**،٦: ۱۳۱

كان بإذن المالك فإنما يجب الضمان إذا قبضه للتملك وهو لم يقبضه له لكونه مكرها على قبضه فكان أمانة كذا في الكافي.[40]

خریدنے پر جبر:

جس طرح بائع کو بیع پر مجبور کرنے کی وجہ سے اس کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے اسی طرح اگر مشتری کو کسی چیز کے خریدنے، اس پر قبضہ کرنے اور ثمن کے حوالہ کرنے پر مجبور کیا تو اس کو بھی اس بیع کے فسخ کرنے کا اختیار ہو گا۔

بدائع الصنائع میں ہے:

فأما إذا كان المكره هو المشتري دون البائع فلكل واحد منهما حق الفسخ قبل القبض وبعد القبض حق الفسخ للمشتري دون البائع لما ذكرنا في إكراه البائع وللمشتري أن يجيز هذا العقد كما للبائع إذا كان مكرها.[41]

حکومت کا ذخیرہ اندوز کو مال فروخت کرنے پر مجبور کرنا:

ذخیرہ اندوزی کو عربی زبان میں "احتکار" کہتے ہیں، لغوی معنی غلہ کو اس نیت سے ذخیرہ کرلینا کہ جب مہنگا ہو جائے گا فروخت کرونگا، شرعاً ذخیرہ اندوزی کا معنی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان یا حیوان کی غذا ہو اس کو ایسے وقت میں ذخیرہ کرلینا جب شہر والوں کو اس کی ضرورت ہو، مقصد یہ ہے کہ بعد میں خوب زیادہ قیمت لے کر فروخت کروں گا، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے قاموس الفقہ میں اس کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے:

"احتکار، اشیاء ضروریہ کو خرید کر اس طرح روک کر رکھنے کا نام ہے جس سے اہلِ شہر کو مشقت ہو"[42]

چونکہ اس سے انسانوں اور حیوانات کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے سختی سے منع فرمادیا اور گناہ قرار دیا، چنانچہ ارشاد ہے:

من احتكر فهو خاطئ[43]

---

[40] ملا خسرو، محمد بن فراموز، **درر الحكام شرح غرر الأحكام، كتاب الاكراه**، باب شروط الاكراه، (بیروت: دارالکتب العلمیۃ)، ۷: ۲۶۶

[41] الكاساني، علاء الدين أبو بكر بن مسعود بن أحمد الحنفي، **بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، كتاب الاكراه**، فصل فی بیان حکم ما یقع علیہ الاکراہ، (بیروت: دار الکتب العلمیۃ)، ۷: ۱۸۸

[42] رحمانی، خالد سیف اللہ، **قاموس الفقہ**، (کراچی: زمزم پبلشرز ۲۰۰۴ء)، ۲: ۳۰

"جو تاجر ذخیرہ اندازی کرے وہ خطاکار ہے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه و سلم : الجالب مرزوق والمحتكر ملعون[44]

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جالب (یعنی غلہ وغیرہ باہر سے لا کر بازار میں بیچنے والا تاجر) مرزوق ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اس کے رزق کا کفیل) اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے (یعنی اللہ کی طرف سے پھٹکارا ہوا اور اس کی رحمت سے دور ہے)۔"

فقہاء کرامؒ نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ ضرورتِ عامہ کے وقت ذخیرہ اندوزوں کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے اور سلطانِ وقت ان کو اپنا سامان بازار میں لانے اور ان کو سامان بیچنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

قال محمد رحمه الله تعالى للإمام أن يجبر المحتكر على البيع إذا خاف الهلاك على أهل المصر ويقول للمحتكر بع بما يبيع الناس وبزيادة يتغابن الناس في مثلها كذا في فتاوى قاضي خان.[45]

مفتی محمد تقی عثمانی فقہ البیوع میں تحریر کرتے ہیں:

وكذلك يجوز الاجبار على البيع اذا احتكر التجار ما يحتاج اليه العامة.[46]

حکومت کا سب کو ایک ہی قیمت پر فروخت کرنے پر جبر (تسعیر کا حکم):

شریعتِ اسلامیہ نے بیع میں قیمت طے کرنے کے سلسلہ میں متعاقدین کو اختیار دیا ہے کہ وہ دونوں آپس کی رضامندی سے مناسب قیمت طے کر لیں، اور ان دونوں کے درمیان کسی کی دخل اندازی کو ناپسند کیا ہے، اسی بات کی طرف رسول اللہ ﷺ نے "بیع الحاضر للبادی" میں اشارہ کیا ہے:

دعوا الناس يرزق الله بعضهم من بعض[47]

---

[43] البیهقي، أحمد بن الحسين بن علي بن موسى أبو بكر، **السنن الصغرى**، باب كراهية الاحتكار، (بیروت: مؤسسة الرسالة)، ۲: ۱۰۵

[44] ایضاً، ۱۰۶

[45] لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي، **الفتاوى الهندية، كتاب البيوع**، فصل فی الاحتکار، (بیروت: دار الفکر)، ۳: ۲۱۴

[46] عثمانی، محمد تقی، **فقہ البیوع**، ۱: ۲۴۳

[47] الترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی بن سورة، **جامع الترمذی، کتاب البیوع**، باب لا یبیع حاضر لباد، ۳: ۵۲۶

"لوگوں کو اپنی حالت پر چھوڑو، اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے ذریعہ رزق دیتے ہیں۔"

اسی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے تسعیر سے صراحتاً منع فرمایا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

غلا السعر على عهد رسول الله صلى الله عليه و سلم فقالوا يا رسول الله سعر لنا قال إن الله هو المسعر القابض الباسط الرزاق وإني لأرجو أن ألقى ربي وليس أحد منكم يطلبني بمظلمة في دم ولامال.[48]

"رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک دفعہ مہنگائی بڑھ گئی، تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ہمارے لیے نرخ مقرر فرمادیں (اور تاجروں کو اس کا پابند کردیں) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نرخ کم وبیش کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہی تنگی اور فراخی کرنے والا ہے، وہی سب کو رزق دینے والا ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ کوئی مجھ سے جان ومال کے ظلم اور حق تلفی کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔"

اس حدیث شریف کے تحت علامہ عبدالرحمن مبارک پوری تحفۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں:

وقد استدل بالحديث وما ورد في معناها على تحريم التسعير وأنه مظلمة ووجهه أن الناس مسلطون على أموالهم والتسعير حجر عليهم والإمام مأمور برعاية مصلحة المسلمين وليس نظره في مصلحة المشتري برخص الثمن أولى من نظره في مصلحة البائع بتوفير الثمن وإذا تقابل الأمران وجب تمكين الفريقين من الاجتهاد لأنفسهم وإلزام صاحب السلعة أن يبيع بما لا يرضى به مناف لقوله تعالى (إلا أن تكون تجارة عن تراض)وإلى هذا ذهب جمهور العلماء۔ وروي عن مالك أنه يجوز للإمام التسعير وأحاديث الباب ترد عليه وظاهر الأحاديث أنه لا فرق بين حالة الغلاء ولا حالة الرخص ولا فرق بين المجلوب وغيره وإلى ذلك مال الجمهور وفي وجه للشافعية جواز التسعير في حالة الغلاء وظاهر الأحاديث عدم الفرق بين ما كان قوتا للادمى ولغيره من الحيوانات وبين ما كان من غير ذلك من الإدامات وسائر الأمتعة.[49]

---

[48] ایضاً، باب التسعیر، ۳: ۶۰۵

[49] المباركفوري، محمد عبدالرحمن بن عبدالرحيم أبو العلا، تحفة الأحوذي بشرح جامع الترمذي، ابواب البيوع، باب ماجاء في المخابرة والمعاوية، (بيروت: دار الكتب العلمية)، ۴: ۴۵۱

اس حدیث کی بناء پر تمام فقہاء متفق ہیں کہ عام حالات میں حکومت کی جانب سے کوئی قیمت متعین کرلینا جائز نہیں، عاقدین قیمت متعین کرنے میں آزاد ہیں جو قیمت آپس کی رضامندی سے طے ہوجائے اسی کا اعتبار ہوگا، چنانچہ صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس لقوله عليه الصلاة والسلام لا تسعروا فإن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق[50]

"حاکمِ وقت کے لیے مناسب نہیں کہ وہ لوگوں کے لیے چیزوں کی قیمت متعین کرلے، آپ ﷺ کی اس فرمان کی وجہ سے کہ "تم نرخ مقرر نہ کرو، کیونکہ نرخ کم وبیش کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہی تنگی اور فراخی کرنے والا ہے، وہی سب کو رزق دینے والا ہے۔"

البتہ اگر تاجر اور کاروباری لوگ نفع کمانے کے لیے چیزوں کی مصنوعی قلت ظاہر کرکے چیزوں کو بہت زیادہ قیمت میں فروخت کرنے لگیں اور اس سے عوام بالخصوص غریب لوگوں کو ضرر اوران پر زیادتی ہورہی ہو، توایسی صورت میں اگر حاکمِ وقت یقین کے ساتھ یہ محسوس کرے کہ تاجروں کی طرف سے عوام پر زیادتی ہورہی ہے، اور تجار افہام وتفہیم اور نصیحت سے اپنے رویہ کی اصلاح نہیں کرتے تو حاکم قیمتیں مقرر کرکے اس پر عملدرآمد کرواسکتاہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ تاجروں کو ظالمانہ نفع اندازی کی چھوٹ دینا فساد فی الارض اور اللہ کی مخلوق پر تباہی لانا ہے۔

چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں ہے:

ومع ذلك فان رؤى منهم جور ظاهر لا يشك فيه الناس جاز تغييره فانه من الافساد في الأرض.[51]

اسی طرح امام مالکؒ نے مؤطا میں سعید ابن المسیبؒ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے مدینہ منورہ کے بازار میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کو دیکھا کہ وہ خشک کھجور کو ایسے نرخ پر فروخت کررہے ہیں جو حضرت عمر کے نزدیک نامناسب حد تک ارزاں ہے، تو آپ نے ان سے فرمایا:

إما أن تزيد في السعر وإما أن ترفع من سوقنا.[52]

---

[50] المرغيناني، علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني أبو الحسن برهان الدين، الهداية في شرح بداية المبتدي، كتاب الكراهية، فصل في البيع، (بيروت: دار احياء التراث العربي)، ۴: ۳۷۷

[51] الدهلوي، الإمام أحمد المعروف بشاه ولي الله ابن عبد الرحيم، حجة الله البالغة، (دار الكتب الحديثة مكتبة المثنى)، احكام البيع ج 1، ص 661

"یا تو تم بھاؤ بڑھاؤ (یعنی مناسب حد تک قیمت بڑھاؤ) یا پھر اپنا مال ہمارے بازار سے اٹھاو۔"

حضرت عمر کی اس اثر کی روشنی میں علماء محققین کی یہ رائے ہے کہ اگر حالات کا تقاضا ہو تو عوام کو تجار کے استحصال اور ان کی زیادتی سے بچانے کے لیے حکومت ضروری اشیاء کی قیمتیں مقرر کر سکتی ہے اور قیمتوں پر عملدر آمد کرواسکتی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا بھی یہی رائے ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

ولهذا كان لولي الأمر أن يكره الناس على بيع ما عندهم بقيمة المثل عند ضرورة الناس إليه.[53]

"اس (ظلم کی) وجہ سے سلطان کو اجازت ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی اپنی چیزوں کو قیمت مثل پر فروخت کرنے پر مجبور کرے جبکہ لوگوں کو ان چیزوں کی ضرورت ہو۔"

نیز امام صاحب جو تسعیر کے مخالف ہیں وہ بھی ان حالات میں عوام کو گرانی سے بچانے کے لیے عارضی تسعیر کی اجازت دیتے ہیں:

فإن كان أرباب الطعام يتحكمون ويتعدون عن القيمة تعديا فاحشا وعجز القاضي عن صيانة حقوق المسلمين إلا بالتسعير فحينئذ لا بأس به بمشورة من أهل الرأي .[54]

"اگر غلہ کے مالکان اجارہ دار بن جائے اور قیمتِ مثل کی حد سے تجاوز کرنے لگے اور قاضی تسعیر (نرخ مقرر کرنے) کے بغیر مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ سے عاجز ہو جائے تو اہلِ رائے اور اہلِ بصیرت لوگوں کے مشورے سے ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

ان سارے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ عام حالات میں قیمت مقرر کرنا جائز نہیں، البتہ غیر معمولی حالات میں جب تجار ضرورت کی اشیاء کو بہت مہنگا بیچنے لگے تو ایسی صورت حال میں حکومت کو تسعیر کی اجازت ہے۔

توسیع مسجد کے لیے گھر فروخت کرنے پر جبر:

عام حالات میں مسجد کی توسیع کے لیے کسی کو اس کی زمین فروخت کرنے پر مجبور کرنا جائز نہیں، لیکن اگر مسجد بہت تنگ ہو اور توسیع کی شدید ضرورت ہو اور قرب وجوار میں کوئی دوسری مسجد بھی موجود نہ ہو تو اس صورت میں مالکِ مکان سے جبراً اس کا گھر یا زمین قیمۃً لی جاسکتی ہے، نیز یہ حکم بھی اس مسجد کے بارے میں ہے جس

---

[52] مالک بن أنس، الموطأ، البیوع، فصل الحکرۃ والتربص، (مؤسسۃ الرسالۃ بیروت)، ۴: ۹۴۲

[53] شیخ الِاسلام ابن تیمیۃ، الحسبۃ لابن تیمیۃ، موقع الاسلام، الاحتساب فی المعاملات المحرمۃ، ۱: ۲۷

[54] ابن الہمام، ھو محمد عبد الواحد بن عبد الحمید کمال الدین، **فتح القدیر، کتاب الکراھیہ**، فصل فی البیع، (کوئٹہ: مکتبۃ رشیدیۃ)، ۲۲: ۲۹۱

کے اندر پانچ وقت نماز کے لیے تنگی ہوتی ہو، اگر صرف جمعہ اور نماز عیدین میں تنگی ہوتی ہو تو اس وقت کسی کی زمین جبراً لینا جائز نہیں۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

وكذا إذا ضاق المسجد على الناس وبجنبه أرض لرجل تؤخذ أرضه بالقيمة كرها لما روي عن الصحابة رضي الله عنهم لما ضاق المسجد الحرام أخذوا أرضين بكره من أصحابها بالقيمة وزادوا في المسجد الحرام.[55]

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

(قوله بالقيمة كرها) لما روي عن الصحابة رضي الله عنهم لما ضاق المسجد الحرام أخذوا أرضين بكره من أصحابها بالقيمة وزادوا في المسجد الحرام بحر عن الزيلعي قال في نور العين ولعل الأخذ كرها ليس في كل مسجد ضاق بل الظاهر أن يختص بما لم يكن في البلد مسجد آخر إذ لو كان فيه مسجد آخر يمكن دفع الضرورة بالذهاب إليه نعم فيه حرج لكن الأخذ كرها أشد حرجا منه ويؤيد ما ذكرنا فعل الصحابة إذ لا مسجد في مكة سوى الحرام.[56]

شارعِ عام کی توسیع کے لیے زمین فروخت کرنے پر جبر:

اگر کسی جگہ پر عوام کی منفعت کے لیے شارعِ عام کو وسیع کیا جارہا ہو اور سڑک کے آس پاس گھر ہوں تو ایسی صورت میں اگر مالکِ مکان اپنا گھر فروخت کرنے پر راضی نہ ہو تو حاکمِ وقت کے لیے شرعاً گنجائش ہے کہ وہ مالکِ مکان سے جبراً اور اس کی رضامندی کے بغیر اس کے مکان کو خرید کر شارعِ عام میں شامل کرے، لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں:

1۔ کہ واقعتاً سڑک کو وسیع کرنے کی ضرورت ہو اور اس کے ارد گرد کوئی اور خالی زمین نہ ہو۔

2۔ مالکِ مکان سے اس وقت تک مکان لینا جائز نہیں جب تک اس مکان کی قیمتِ مثلی اس کے حوالہ نہ کی جائے۔

[55] ابن نجیم زین الدین بن إبراهيم بن محمد، **البحر الرائق، کتاب البیع**، (بیروت: دار الكتاب الإسلامي،)، ۵: ۲۷۶

[56] ابن عابدین، محمد أمين بن عمر الحنفي، رد المحتار على الدر المختار، کتاب الوقف، مطلب في الوقف إذا خرب ولم يمكن عمارته، ۴: ۳۷۹

حکومت کی طرف سے تحدید ملکیت:

مصالحِ عامہ کے پیشِ نظر اسلامی حکومت کو اپنی رعایا کے لیے ملکیت کی کوئی حد مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تحدید ملکیت کی کئی صورتیں ہیں:

1۔ تحدیدِ ملکیت کی پہلی صورت یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے ملکیت کی ایک مستقل حد مقرر کرلی جائے، اور اس سے زیادہ کوئی چیز ملکیت میں لانے یا رکھنے کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے، اس طرح کی مستقل حد مقرر کرلینا قرآن وحدیث کی رُو سے جائز نہیں۔

اسلام نے جائز ملکیت پر کوئی حد عائد نہیں کی ہے، شرعی حدود کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی ملکیت میں اضافہ کرنا جائز ہے، اور شریعت نے جس چیز کو جائز قرار دیا ہو اس کو مستقل طور پر ممنوع قرار دینے کا حق کسی کو نہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کئی جگہوں میں بیان فرمایا ہے کہ جس طرح کسی کو حرام چیزوں کو حلال کرنے کا اختیار نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حلال چیز حرام کرنے کا اختیار نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ[57]

"اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں، ان کو حرام نہ ٹھہراؤ، اور حد سے تجاوز نہ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۚ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ[58]

"واقعی خسارے میں ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی میں نادانی سے قتل کر ڈالا، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں جو رزق عطا فرمایا تھا اس کو حرام کرلیا، اللہ پر بہتان باندھ کر، یہ لوگ گمراہ ہوئے اور راہ پر نہیں آئے۔"

---

[57] المائدۃ:۸۷

[58] الانعام:۱۴۰

لہٰذا جب قرآن و سنت نے جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی املاک کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی، تو اپنی طرف سے کوئی حد مقرر کرکے اس سے زائد املاک کے حصول کو مستقل طور پر ممنوع قرار دینا ایک حلال چیز کو حرام کرنا ہے، جس کا کسی کو اختیار نہیں، اور اگر کوئی قانون مستقل طور پر ایسی تحدید عائد کرے تو وہ قرآن و سنت کے احکام سے یقیناً متصادم ہو گا۔

عارضی تحدید ملکیت:

تحدیدِ ملکیت کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی مصلحتِ عامہ کے پیش نظر عارضی طور پر کچھ عرصے کے لیے ملکیت کی کوئی حد مقرر کی جائے، اس عارضی تحدید ملکیت کی دو صورتیں ہیں:

1۔ یہ ہے کہ مالکوں کی املاک چھیڑے بغیر یہ حکم جاری کیا جائے کہ آئندہ کوئی شخص فلاں چیز ایک مقررہ حد سے زیادہ اپنی ملکیت میں نہیں لا سکے گا۔

2۔ یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی ملکیت کی ایک حد مقرر کر دی جائے اور یہ قانون بنایا جائے کہ جس کے پاس وہ چیز اس مقررہ حد سے زیادہ ہو، اُسے وہ زائد مقدار حکومت کے حوالے کرنی ہو گی، اور آئندہ اس مقدار سے زیادہ وہ چیز اپنی ملکیت میں لانا جائز نہیں ہو گا۔

پہلی صورت در حقیقت تحدیدِ ملکیت کی نہیں بلکہ ملکیت کی کسی خاص شکل کے حد سے زیادہ استعمال پر پابندی ہے، مثلاً مصالحِ عامہ کے پیش نظر عارضی طور پر یہ قانون بنا دیا جائے کہ جس شخص کے پاس رہائش کے لیے ایک مقررہ رقبے کا مکان موجود ہے، اب وہ کوئی نیا مکان نہیں بنا سکتا۔ اگر مصالحِ عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس قسم کی تحدید حکومت کی طرف عائد کی جائے اور اس کا مقصد کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا نہ ہو بلکہ عارضی طور ایک انتظامی حکم جاری کرنا ہو تو اس کی گنجائش ہے، اس لیے کہ اس کا حاصل ایک مباح کام پر عارضی پابندی لگانا ہے اور اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ مصالحِ عامہ کے پیش نظر کسی مباح کام پر عارضی طور سے پابندی لگائے، اور ایسی صورت میں عوام پر حکومت کے حکم کی تعمیل واجب ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ [59]

---

[59] النساء: 59

"اے ایمان والوں! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اور اپنے میں سے ذمہ داروں کی اطاعت کرو۔"

اس آیت میں "اولوالامر" کی اطاعت کے یہی معنی ہوسکتے ہیں کہ مباحات کے سلسلہ میں جب وہ کوئی حکم دیں تو ان کی اطاعت واجب ہے، بشرطیکہ ان کا وہ حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو، اگر ان کی اطاعت میں اللہ اور رسول ﷺ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو تو پھر امیر ہونے کی حیثیت سے ان کا حکم ماننا لازم ہے۔

آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

السمع والطاعة حق ما لم يؤمر بمعصية فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة.[60]

"(امیر کی بات) ماننا اور سننا برحق ہے جب تک وہ کسی معصیت کا حکم نہ دے، پس اگر کسی معصیت کا حکم دے تو پھر سننا ماننا نہیں۔"

فقہاء کرام نے بھی یہ اصول اپنی کتب میں ذکر فرمایا ہے کہ مباحات میں امیر کا حکم واجب التعمیل ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے:

لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة.[61]

"امام کی اطاعت ان چیزوں میں واجب ہے جو معصیت نہ ہو۔"

لیکن یاد رہے کہ اس اصول کے ساتھ اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ امام کا حکم قرآن وحدیث کے مخالف نہ ہو، مباحات سے متعلق ہو، اس میں عوام کی مصلحت ہو اور اس سے کسی پر ظلم نہ ہوتا ہو۔

چنانچہ علماء اصولیین لکھتے ہیں :

تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة.[62]

"امام کا رعیت پر تصرف مصلحت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔"

---

[60] البخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم، صحیح البخاری، کتاب الأحکام باب السمع والطاعة للإمام مالم تکن معصیة

[61] ابن عابدین، محمد أمین بن عمر بن عبد العزیز عابدین الدمشقي الحنفي، **رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الصلوة**، باب العیدین، ۲: ۱۷۲

[62] ابن نجیم زین الدین بن ابراھیم بن محمد، الاشباہ والنظائر، (بیروت: دار الکتاب الإسلامي)، ۱: ۱۴۹

پس اگر اسلامی حکومت مصالحِ عامہ کے پیش نظر یہ حکم جاری کرے کہ آئندہ کوئی شخص فلاں چیز مقررہ حد سے زیادہ اپنے اختیار سے اپنی ملکیت میں نہ رکھے تو ایسا حکم شریعت کے خلاف نہیں اس لیے ایسا حکم واجب التعمیل ہے۔

مالکوں سے املاک چھین کر تحدید ملکیت:

تحدیدِ ملکیت کی ایک صورت یہ ہے کہ مالکوں سے ان کے املاک چھین کر ان پر تحدید عائد کی جائے، پھر اس تحدید کی دو صورتیں ہیں:

1۔ چھینی ہوئی ملکیت کا کوئی معاوضہ اس کے مالک کو ادا نہ کیا جائے۔

2۔ جو ملکیت چھینی گئی ہے اس کا معاوضہ اس کے مالک کو ادا کیا جائے۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے کہ بلا معاوضہ کسی شخص سے اس کی ملکیت پر قبضہ کیا جائے تو اگر وہ جائیدادیں ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہیں تو انہیں ضبط کر کے اصل مالکوں یا مستحقین کو دیدینا نہ صرف جائز بلکہ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے، لیکن اگر وہ جائیدادیں جائز طور پر حاصل کی گئی ہوں تو قرآن وحدیث کی رو سے اس پر قبضہ کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ ذیل میں قرآن و حدیث اور اسلامی احکام کی روشنی میں کسی کی ملکیت پر بلا معاوضہ قبضہ کرنے کی حرمت کے بارے میں کچھ تفصیل بیان کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللهِ يَسِيْرًا[63]

"اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، الا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو (تو وہ جائز ہے)، اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، یقین جانو اللہ تم پر بہت مہربان ہے، اور جو شخص زیادتی اور ظلم کے طور پر ایسا کرے گا، تو ہم اس کو آگ میں داخل کریں گے اور یہ بات اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔"

[63] النساء:۲۹

آیت میں جو "ناحق طور پر" کہا گیا ہے، اس کی تفسیر میں امام فخر الدین رازیؒ حضرت عبد اللہ ابن عباس اور حضرت حسن بصریؒ سے نقل کرتے ہیں:

ان الباطل هو كل ما يؤخذ من الانسان بغير عوض.[64]

"ناحق ہر وہ مال ہے جو کسی انسان سے بلا معاوضہ (زبردستی) لیا جائے۔"

مذکورہ بالا آیت میں واضح طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کا کوئی بھی مال اس کی مرضی اور معاوضہ کے بغیر کسی لیے حلال نہیں۔

اسی اصول کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ اس طرح ذکر کیا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ[65]

"اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، اور نہ ان کا مقدمہ حاکموں کے پاس اس غرض سے لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہڑپ کرنے کا گناہ کرو۔"

مذکورہ آیاتِ قرآنی علی العموم خواہ حکومت کی طرف سے یا کسی اور شخص کی جانب سے لوگوں کی جائز املاک کو بلا معاوضہ زبردستی لینے کی حرمت پر دلالت کر رہی ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو عظیم الشان تاریخی خطبہ دیا، اس میں آپ ﷺ نے اسلامی احکامات اور اسلامی تعلیمات کو نہایت واضح الفاظ میں بیان فرمایا، اس خطبے کا ایک اہم جزیہ ہے:

قال فإن دماءكم وأموالكم وأعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا في بلدكم هذا في شهركم هذا.[66]

"پس تمہارے خون، تمہارے مال، اور تمہاری آبرو تم پر ایسی ہی حرمت کی حامل ہے جیسے اس (مبارک) مہینے اور اس (مبارک) شہر میں تمہارے اس دن (یعنی یوم حج) کی حرمت ہے۔"

---

[64] فخر الدين الرازي، محمد بن عمر بن الحسين الرازي الشافعي، **تفسیر الفخر الرازی**، (بیروت: دار إحياء التراث العربي)، ا: ۱۴۳۱

[65] البقرہ:۱۸۸

[66] الترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی بن سورة، جامع الترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ التوبہ، ۵: ۲۷۳

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

من ظلم قيد شبر من الأرض طوقه سبع أرضين.[67]

"جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین بھی ناحق لے لے، اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈالا جائے گا۔"

حضرت عبد اللہ ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ:

عن ابن مسعود قال قلت يا رسول الله أي الظلم أظلم ؟ قال ذراع من الأرض ينتقصها المرء المسلم من حق أخيه فليس حصاة من الأرض يأخذها أحد إلا طوقها يوم القيامة إلى قعر الأرض ولا يعلم قعرها إلا الله عز وجل الذي خلقها.[68]

"میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! سب سے بڑا ظلم کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر ایک گز زمین بھی کوئی مسلمان شخص اپنے بھائی کے حق میں سے کم کرے، تو زمین کا ایک کنکر بھی جو کوئی اٹھالے گا، تو اسے قیامت کے دن زمین کے تہہ تک اس کے گردن میں طوق بنادیا جائے گا، اور زمین کی تہہ کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں جس نے اس کو پیدا کیا۔"

قرآن وسنت کی مذکورہ بالا دلائل کی وجہ سے فقہاء امت کا اس بات پر اجماع اور اتفاق ہے کہ کسی شخص کی جائز ملکیت اس کی رضامندی کے بغیر زبردستی چھیننا کسی کے لیے جائز نہیں۔ علامہ ابن حزمؒ نے اپنی کتاب میں ان مسائل کو جمع کیا ہے جن پر امت کے تمام علماء اور فقہاء کا اجماع ہے، آپؒ لکھتے ہیں:

واتفقوا أن اخذ أموال الناس كلها ظلما لا يحل .[69]

"اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ لوگوں کے کسی بھی قسم کے مال کو ناحق لے لینا حلال نہیں۔"

علامہ ابن رشد اندلسیؒ لکھتے ہیں:

أنه لا يحل مال أحد إلا بطيب نفس منه كما قال عليه الصلاة والسلام وانعقد عليه الإجماع .[70]

---

[67] المتقي الهندي، علاء الدين علي بن حسام الدين، كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، (بيروت: مؤسسة الرسالة،)، ۳: ۵۰۳

[68] الشيباني، احمد بن حنبل، مسند احمد، (بيروت: عالم الكتب)، ۱: ۳۹۷

[69] ابن حزم الأندلسي، أبو محمد علي بن أحمد بن سعيد، مراتب الإجماع في العبادات والمعاملات والاعتقادات، كتاب الغَصْب، (بيروت: دار الكتب العلمية)، ۱: ۵۹

[70] ابن رشد القرطبي، أبو الوليد محمد بن أحمد بن محمد بن أحمد، بداية المجتهد ونهاية المقتصد، كتاب البيوع، (مكتبة المدينة الرقمية)، ۲: ۱۶۷

"کسی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر دوسرے کے لیے حلال نہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے بھی فرمایاہے اور اسی پر اجماع منعقد ہو چکاہے۔"

امام ابو یوسفؒ "کتاب الخراج" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

وكل من أقطعه الولاة المهديون أرضا من ارض السواد وارض العرب والجبال من الأصناف التي ذكرنا أن للإمام أن يقطع منها فلا يحل لمن يأتي بعدهم من الخلفاء أن يرد ذلك ولا يخرجه من يدي من هو فِي يده وارثا أو مشتريا فأما عن أخذ الوالي من يد واحد أرضا وأقطعها آخر فهذا بمنزلة الغاصب غصب واحدا وأعطى آخر فلا يحل للإمام ولا يسعه أن يقطع أحدا من الناس حق مسلم ولا معاهد ولا يخرج من يده من ذلك شيئا إلا بحق يجب لَهُ عليه فيأخذه بذلك الذي وجب لَهُ عليه فيقطعه من أحب من الناس فذلك جائز لَهُ والأرض عندي بمنزلة المال فللإمام أن يجيز من بيت المال من كان لَهُ غناء فِي الإسلام ومن يقوى به عَلَى العدو ويعمل فِي ذلك بالذي يرى أنه خير للمسلمين وأصلح لأمرهم وكذلك الأرضون يقطع الإمام منها من أحب من الأصناف التي سميت ولا أرى أن يترك أرضا لا ملك لأحد فيها ولا عمارة حَتَّى يقطعها الإمام فإن ذلك أعمر للبلاد وأكثر للخراج .[71]

"اور زمین کے جن قسموں کے بارے میں میں نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ امام (اسلامی حکومت) وہ زمینیں کسی کو بطورِ عطیہ دے سکتاہے، ان میں سے جو زمینیں پچھلے ہدایت یافتہ سربراہان حکومت نے جن لوگوں کو دی ہیں ،خواہ وہ سواد (عراق) کی زمینیں ہوں یا عرب کی، یا پہاڑوں کی، بعد میں آنے والے خلفاء کے لیے جائز نہیں کہ ان کو ان سے واپس لے لیں، اور نہ یہ جائز ہے کہ جن کے ہاتھ میں اب وہ زمینیں ہیں، خواہ انہیں بطورِ وراثت ملی ہوں یا انہوں نے اصل مالکوں سے خرید کر حاصل کی ہوں، ان کے قبضے سے انہیں نکالا جائے، رہی یہ بات کہ امام ایک شخص سے زمین لے کر دوسرے کو دیدے تو یہ بالکل غصب کے حکم میں ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کا مال غصب کر کے دوسرے کو دیدیا، امام کے لیے حلال نہیں ہے، اور اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان یا اسلامی ریاست کے کسی غیر مسلم شہری کا حق چھین کر کسی اور کو دیدے، اور نہ اس کے لیے جائز ہے کہ اس کے زمین کو اس کے قبضہ سے نکالا جائے، ہاں اگر حکومت کا کوئی حق کسی کے ذمہ واجب ہے، اور وہ اس واجب حق کی بناء پر کوئی زمین اس سے لے لے، اور پھر وہ زمین کسی اور شخص کو اپنی صوابدید سے دے دے تو یہ اس کے لیے جائز

[71] ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، فصل فی ذکر القطائع، (القاہرۃ: المکتبۃ السلفیۃ)، ا: ٦٠

ہے، اور زمین میرے نزدیک عام اموال کی طرح ہے، امام کو یہ حق حاصل ہے کہ جس کسی شخص سے اسلام کو فائدہ پہنچتا ہو، یا جس سے دشمن کے خلاف قوت حاصل ہوتی ہو، اس کو بیت المال سے کوئی عطیہ دے دے، اور ہر وہ اقدام کرے جس میں مسلمانوں کی بھلائی، اور ان کے معاملات کی مصلحت ہو، یہی حال زمین کا ہے، زمین کی جن قسموں کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے، امام وہ زمینیں مصلحت کے مطابق جسے چاہے دے سکتا ہے، اور میری رائے یہ ہے کہ امام کو زمین یا عمارت ایسی نہیں چھوڑنی چاہیے جس پر کسی شخص کی ملکیت نہ ہو، بلکہ ایسی زمین لوگوں میں تقسیم کر دینی چاہیے کیونکہ اس سے ملک آباد ہوگا، اور اس سے آمدنی زیادہ ہوگی۔

امام غزالیؒ نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے کہ آیا کوئی حکومت مصالحِ عامہ کے تحت لوگوں کی املاک زبردستی چھین سکتی ہے یا نہیں؟

فان قال قائل : اذا رای الامام جمعا من الاغنیاء یسرفون فی الاموال ویبذرون ویصرفونها الی وجوه من الترفه والتنعم وضروب الفسادفلو رای المصلحة فی معاقبتهم یاخذ شیئ من اموالهم ورده الی بیت المال وصرفه الی وجوه المصالح فهل له ذلك ؟ قلنا : لاوجه له فان ذلك عقوبة ینتقص الملك واخذ المال والشرع لم یشرع المصادرة فی الاموال عقوبة علی جنایة مع کثرة العقوبات والجنایات ... والزجر حاصل بالطرق المشروعة.[72]

"اگر کوئی یہ کہے کہ جب امام مالداروں کے ایک گروہ کو دیکھ رہا ہو کہ وہ اپنی املاک میں اسراف اور فضول خرچی سے کام لے رہے ہیں اور ان کو عیش و آرام کے مختلف طریقوں اور طرح طرح کے اسباب میں خرچ کر رہے ہیں، تو اگر وہ مصلحت اس میں سمجھے کہ اس عمل کی سزا کے طور پر ان سے اس کے کچھ اموال چھین لے اور انہیں بیت المال میں داخل کر کے ان کو مصالحِ عامہ میں خرچ کرے تو کیا اسے یہ اختیار ہے؟"

ہمارا جواب یہ ہے کہ اس کا کوئی جواز نہیں، اس لیے کہ یہ سزا ملکیت میں کمی اور اموال کو چھین کر دی جارہی ہے، اور شریعت نے کسی کے مال پر زبردستی قبضہ کرنے کو کسی جرم کی سزا کے طور پر مقرر نہیں کیا، حالانکہ شرعی سزاؤں کی بہت سی قسمیں ہیں... جہاں تک فساد سے لوگوں کو روکنے کا تعلق ہے تو یہ مقصد ان طریقوں کو اختیار کر کے حاصل کیا جاسکتا ہے جو شرعاً جائز ہے۔ مذکورہ بالا قرآنی آیات، احادیث، اجماع اور فقہاء کے اقوال

[72] الغزالی، أبو حامد، محمد بن محمد الغزالي الطوسي، شفاء العليل، (بيروت: دار الكتب العلمية،)، ۲۴۳

سے یہی ثابت ہوا کہ کسی کی جائز ملکیت کو بلا معاوضہ اس کی رضامندی کے بغیر زبردستی لینا نہ فرد کے لیے جائز ہے اور نہ ہی حکومت کے لیے۔

معاوضہ دے کر املاک کی جبری وصولی:

تحدید ملکیت کی دوسری صورت معاوضہ دے کر املاک کی جبری وصولی ہے، یہ درحقیقت جبری بیع ہے جس کا عدم جواز پیچھے "بیع میں تراضی کی قید کی حقیقت" کے عنوان میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ البتہ بعض ناگزیز حالات میں استثنائی صورتیں موجود ہیں جن میں کسی شدید ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جبری بیع کو اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا، صرف ایسی شدید صورت میں شریعت نے جبری بیع کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ:

عن عقبة بن عامر قال : قلت يا رسول الله إنا نمر بقوم فلا هم يضيفونا ولهم يؤذون ما لنا عليهم من الحق ولا نحن نأخذ منهم فقال رسول الله صلى الله عليه و سلم إن أبوا إلا أن تأخذوا كرها فخذوا.[73]

"حضرت عقبہ بن عامر فرماتے ہیں کہ میں نے کہا یارسول اللہ! ہم کسی قوم کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ نہ ہماری مہمان نوازی کرتے ہیں اور نہ وہ حقوق ادا کرتے ہیں جو ہمارے ان پر واجب ہے، اور نہ ہم ان سے لیتے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر وہ لوگ زبردستی کیے بغیر بیچنے سے انکار کریں تو ان سے زبردستی لے لو۔"

امام ترمذیؒ اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وإنما معنى هذا الحديث أنهم كانوا يخرجون في الغزو فيمرون بقوم ولا يجدون من الطعام ما يشترون بالثمن وقال النبي ﷺ إن أبوا أن يبيعوا إلا أن تأخذوا كرها فخذوا هكذا روي في بعض الحديث مفسرا.[74]

"اس حدیث کے معنی یہ ہے کہ صحابہ کرام جہاد کے لیے جایا کرتے تھے، وہ کسی قوم کے پاس سے گزرتے تھے اور کوئی ایسا کھانا موجود نہیں ہوتا تھا جسے وہ قیمت دے کر خرید سکے، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر وہ لوگ زبردستی کیے بغیر بیچنے سے انکار کریں تو ان سے زبردستی لے لو، بعض احادیث میں اس واقعہ کی یہی تفصیل مروی ہے۔"

---

[73] الترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی بن سورۃ، جامع الترمذی، کتاب السیر، ما یحل من أموال أهل الذمة، ۴: ۱۴۸

[74] ایضاً

شدید ضرورت کے وقت جبری بیع کے جواز کے سلسلہ میں خلفائے راشدین کے زمانہ میں ایک واقعہ مسجد حرام کی توسیع کے بارے پیش آیا تھا جس کو امام ابو الولید ازرقیؒ بیان کیا ہے:

عن ابن جریج قال: کان المسجد الحرام لیس علیه جدران محاطة انما کانت الدور محدقة به من کل جانب غیر ان بین الدور ابوابا یدخل منهاالناس من کل نواحیه فضاق علی الناس فاشتری عمرؓ دورا فهدمهاوهدم علی من قرب من المسجد وابی بعضهم ان یاخذ من الثمن وتمنع من البیع فوضعت اثمانا فی خزانة الکعبة حتی اخذوها بعدثم احاط علیه جدارا قصیرا وقال لهم عمر: انما نزلتم علی الکعبة فهو فناءها ولم تنزل الکعبة علیکم ثم کثر الناس فی زمن عثمان بن عفان ؓ فوسع المسجد واشتری من قوم وابی آخرون ان یبیعوا فهدم علیهم فصیحوا به فدعاهم فقال: انما جرا کم علی حلمی عنکم، فقد فعل بکم عمر هذا فلم یصح به احد فاحتذیت علی مثله فصیحتم بی ثم امرهم الی الحبس حتی کلمه فیهم عبد الله بن خالد بن اسید فترکهم [75]

"حضرت ابن جریجؒ فرماتے ہیں کہ پہلے مسجد حرام کے گرد کوئی چار دیواری نہیں تھی بلکہ اسے چاروں طرف سے گھروں نے گھیرا ہوا تھا البتہ گھروں کے درمیان دروازے تھے جن کے ذریعہ لوگ مسجد میں داخل ہوتے تھے پھر مسجد لوگوں کے لیے تنگ ہو گئی تو حضرت عمر نے گھروں کو خرید کر انہیں منہدم کر دیا اور جن لوگوں کے گھر مسجد کے بالکل قریب تھے انہیں گروادیا لیکن بعض لوگوں نے قیمت لینے اور اور گھر بیچنے سے انکار کر دیا چنانچہ ان کے گھروں کی قیمتیں کعبے کی الماری میں رکھ دی گئیں یہاں تک کہ بعد میں انہوں نے لے لیں، اس کے بعد حضرت عمر نے مسجد کے گرد چھوٹی سی دیوار بنوادی، اور جو لوگ بیچنے سے انکار کر رہے تھے ان سے فرمایا کہ "تم لوگ کعبہ پر آکر اتر گئے ہو جبکہ یہ جگہ کعبہ کی صحن تھی اور کعبہ تم پر آکر نہیں اترا" پھر حضرت عثمان کے دور میں لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گئی، آپ نے مسجد حرام میں توسیع کی اور کچھ لوگوں سے زمین خریدی، جبکہ بعض لوگوں نے زمین بیچنے سے انکار کر دیا، تو آپ نے ان کے گھر منہدم کروادیئے، اس پر ان لوگوں نے شدید احتجاج کیا تو حضرت عثمان نے ان لوگوں کو بلایا اور فرمایا: میری

---

[75] الأزرقي، أبو الوليد محمد بن عبد الله بن أحمد، أخبار مكة وما جاء فيها من الآثار، باب محيط الحرم و تفصيلاته، (المكة المكرمة: مكتبة الثقافة الدينية،)، ٢: ٦٤

حلم نے تم لوگوں کو مجھ پر جری کر دیا ہے، حضرت عمر نے بھی تمہارے ساتھ یہی کیا تھا اور اس پر کسی نے احتجاج نہیں کیا، اور میں نے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی تو تم احتجاج کرتے ہو، اس کے بعد ان سب لوگوں کو قید کرنے کا حکم دیا مگر حضرت عبد اللہ بن خالد بن اسید کے گفتگو کے نتیجہ میں انہیں چھوڑ دیا۔"

مذکورہ بالا دونوں واقعات سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ کسی شخص کی جائیداد کی جبری خریداری جائز نہیں ہے لیکن شدید اور ناگزیر ضرورت کے وقت اس کی گنجائش ہے۔ اسی اصول کو فقہاء کرام نے اپنی کتب میں مختلف تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے۔

چنانچہ علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

تؤخذ أرض ودار وحانوت بجنب مسجد ضاق على الناس بالقيمة كرها.[76]

"جو مسجد لوگوں کے لیے تنگ ہو گئی ہو اور اس کے قریب کوئی گھر یا دکان یا زمین ہو تو اسے قیمت کے ذریعہ زبردستی خریدا جا سکتا ہے۔"

علامہ مواق مالکیؒ لکھتے ہیں:

ويكره الناس السلطان على بيعها اذا احتاج الناس اليها لجامعهم الذى فيه الخطبة وكذلك الطريق اليها لا الى المسجد الذى لا خطبة فيها والطرق التى فى القبائل لا قوام.[77]

"اگر لوگوں کو اپنی ایسی جامع مسجد کے لیے گھروں کی جگہ کی ضرورت ہو جس میں خطبہ ہوتا ہو یا اس جامع مسجد تک جانے کے لیے راستے کی ضرورت ہو تو سلطان مالکوں کو اس کی بیع پر مجبور کر سکتا ہے، لیکن جن مسجدوں میں خطبہ نہیں ہوتا یا قبائل کے لیے بنے ہوئے راستوں میں توسیع کے لیے لوگوں کو بیع پر مجبور کرنا جائز نہیں۔"

آنحضرت ﷺ کی احادیث، صحابہ کرام کے عمل اور فقہائے کرام کی تصریحات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی شخص کو اپنی ملکیت فروخت کرنے پر عام حالات میں مجبور کرنا بالکل جائز نہیں ہے، لیکن کسی شدید ضرورت کی بناء پر حکومتِ اسلامی کسی شخص کو بیع پر مجبور کر سکتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ضرورت کیا ہے، تو اس کو سمجھنے کے لیے فقہاء نے پانچ درجات بیان کیے ہیں:

[76] الحصكفي، علاء الدين محمد بن علي بن محمد الحِصْني الحنفي، الدر المختار، كتاب الوقف، مطلب في الوقف إذا خرب ولم يمكن عمارته، ۴: ۳۷۹

[77] محمد بن يوسف بن أبي القاسم العبدري أبو عبد الله، التاج والإكليل لمختصر خليل، كتاب الوقف والهبة واللقطة، (بيروت: دار الفكر)، ٦: ۴۲

1۔ضرورت:

فالضرورة: بلوغه حدا ان لم يتناول الممنوع هلك أو قارب كالمضطر للأكل واللبس بحيث لو بقى جائعا أو عريانا لمات أو تلف منه عضو وهذا يبيح تناول المحرم .[78]

"کسی کا ایسی حد پر پہنچ جانا کہ اگر وہ حرام کا ارتکاب نہ کرے تو یا تو مالکل ہلاک ہو جائے یا ہلاکت کے قریب ہو جائے، مثلاوہ شخص جو کھانے یا پہننے کے لیے اتنا مجبور ہو جائے کہ اگر وہ بھوکا یا ننگا رہے تو مر جائے یا اس کا کوئی عضو تلف ہو جائے تو ایسے موقع پر حرام کا ارتکاب مباح ہو جاتا ہے۔"

2۔حاجت:

ان يكون الانسان فى حالة من الجهد والمشقة التى لا تؤدى به الى الهلاك اذا لم يتناول المحرم شرعا.[79]

"انسان ایسی حالت میں ہو کہ اگر وہ حرامِ شرعی کا ارتکاب نہ کرے تو ہلاک تو نہیں ہو گا البتہ شدید مشقت ہو گی۔"

اس کا حکم فقہاء نے یہ بیان کیا ہے کہ:

وهذا لا يبيع الحرام ويبيح الفطر في الصوم.[80]

"اس حالت میں حرام کا ارتکاب تو جائز نہیں البتہ روزہ توڑنا جائز ہے۔"

3۔منفعت:

اس کی تعریف مفتی محمد تقی نے یہ کی ہے کہ:"یہ ایسی حالت کا نام ہے جس میں ناجائز کام کا ارتکاب نہ کرنے سے نہ تو ہلاکت کا اندیشہ ہے، نہ کوئی شدید مشقت پیش آتی ہے، البتہ وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو ناجائز کام سے بظاہر حاصل ہوتا"[81]

---

[78] الحموي، السيد احمد بن محمد الحنفي، غمز عيون البصائر شرح کتاب الاشباہ والنظائر، (بیروت: دار الکتب العلمیۃ،)، ۱: ۲۷۷

[79] مجلة مجمع الفقه الإسلامي، وهي مجلة معروفة تصدر عن مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي، الأخذ بالرخص الشرعية وحكمه، ۲: ۱۵۷۰۲

[80] ایضاً

[81] عثمانی، محمد تقی، عدالتی فیصلے، (کراچی: ادارۃ المعارف، ۲۰۰۵ء)

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس بھوک مٹانے کے لیے جو کی روٹی موجود ہے، لیکن اس کو گندم کی روٹی اور بکری کے گوشت کھانے کا شوق ہے، جو کی روٹی پسند نہیں، اس سے کسی حکمِ شرعی میں تبدیلی نہیں آسکتی۔

علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

والمنفعة كالذي يشتهي خبز البر ولحم الغنم والطعام الدسم.[82]

4۔زینت:

یہ ایسی حالت کا نام ہے کہ ناجائز کام نہ کرنے سے نہ تو ہلاکت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی مشقت پیش آتی ہے ،اور ناجائز کام کرنے سے کوئی خاص فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا، البتہ ظاہری سجاوٹ کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ: "کسی شخص کے پاس کپڑے تو موجود ہیں لیکن وہ چاہتا ہے کہ فیشن کے مطابق کپڑے حاصل کرے، اس درجہ سے بھی حکمِ شرعی تبدیل نہیں ہوتا"[83]

علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

والزينة كالمشتهي الحلوى والسكر والثوب المنسوج من حرير وكتان.[84]

5۔فضول:

یہ ایسی حالت کا نام ہے کہ جس میں ناجائز کام کے ارتکاب سے نہ تو ہلاکت دور کرنا مقصود ہوتا ہے، نہ مشقت کو اور نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس درجہ میں بطریقِ اولیٰ کوئی حکمِ شرعی تبدیل نہیں ہوگا۔

ان پانچ درجات میں صرف "ضرورت "ایک ایسادرجہ ہے جس کی بنیاد پر بقدرِ ضرورت حرام کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے، اور دوسرا درجہ "حاجت "میں اگرچہ حرام چیز کے استعمال کا جواز نہیں ہوتا لیکن اگر وہ حاجت عمومی شکل اختیار کر جائے یعنی حاجت اجتماعی ہو، انفرادی نہ ہو، تو وہ حاجتِ اجتماعی بھی بہت سارے مسائل میں "ضرورت "کے درجہ میں آجاتی ہے اور اس کی وجہ سے احکام میں تغیر ہو سکتا ہے، چنانچہ فقہاء کرام نے ایک اصول بیان فرمایا ہے:

---

[82] السیوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة الضرر يزال، (بیروت: دار الكتب العلمية، بيروت)، ا: ۸۵

[83] عثمانی، محمد تقی، عدالتی فیصلے

[84] السیوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة الضرر يزال، ا: ۸۵

الحاجة العامة تنزل منزلة الضرورة الخاصة في حق آحاد الناس .[85]

"عمومی حاجت کو اس انفرادی ضرورت کے قائم مقام کیا جا سکتا ہے جو افراد کو پیش آتی ہے۔"

لہذا ان پانچ درجات میں سے صرف "ضرورت" اور "عمومی حاجت" کے وقت جبری بیع کے جواز کی گنجائش ہے، بقیہ تین درجات "منفعت، زینت اور فضول" کے لیے جبری بیع جائز نہیں۔

جبری بیع کے جواز کی شرائط:

"ضرورت اور حاجتِ اجتماعی" کے لیے جبری بیع کے جواز کے لیے بھی کچھ شرائط ہیں جن کا لحاظ رکھنا لازم ہے:

1۔ ضرورت یا حاجتِ اجتماعی کو دور کرنے کا اس جبری بیع کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو، اور جبری بیع کا فیصلہ تمام ممکنہ متبادل طریقوں کے بعد کیا گیا، لہذا مفادِ عامہ کے مجمل بنیاد پر جبری بیع جائز نہیں جب تک واقعی ضرورت اور حاجتِ اجتماعی کا تیقن نہ ہو۔

2۔ جبری بیع میں جو چیز زبردستی لی جا رہی ہے اس کا معاوضہ بازاری قیمت کے مطابق ادا کرنا لازم ہے۔

3۔ بازاری قیمت کے مطابق مطلوبہ چیز کا معاوضہ اس چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے یا قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ ادا کرنا لازم ہے البتہ اتنی تاخیر جس کو عموماً نظر انداز کیا جاتا ہو تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

ان شرائط کی موجودگی میں حاکم کے لیے کسی کی ملکیت جبری طور پر لینے کی گنجائش ہے۔

نتائج:

1۔ شرعاً وہی بیع معتبر اور قابلِ نفاذ ہے جو فریقین کی باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو، کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف زبردستی بیع پر مجبور کرنا جائز نہیں۔

2۔ اکراہ کی صورت میں اگر بائع کو ثمن لینے پر مجبور کیا جائے تو اس سے عقد لازم نہیں ہوتا بلکہ بائع کا اس ثمن کو مشتری پر لوٹانا ضروری ہے، کیونکہ اکراہ کی وجہ سے یہ عقد فاسد ہے۔

3۔ اکراہ زائل ہو جانے کے بعد مکرَہ کو حالتِ اکراہ میں کی گئی بیع کو جاری رکھنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے، اور اگر مشتری نے اس میں تصرفات کیے ہوں تو بائعِ مکرَہ اس کے تصرفات کو جاری رکھ کر سکتا ہے۔

---

85 الزرکشي، محمد بن بهادر بن عبد الله، المنثور في القواعد، حرف الحاء المهملة، (کویت: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية)، ۲: ۲۴

4۔ جبری بیع میں اگر عین میں کوئی نقصان آجائے، تو اس کا حکم غصب کی طرح ہے، عین کو مالک پر لوٹایا جائے گا اور نقصان کا تاوان مالک کو دیا جائے گا، اگر نقصان اس کی قیمت گرنے کی وجہ سے ہو تو اس کا کوئی ضمان واجب نہیں۔

6۔ ضرورتِ عامہ کے وقت ذخیرہ اندوزوں کے خلاف قانونی کاروائی کی جاسکتی ہے اور سلطانِ وقت ان کو اپنا سامان بازار میں لانے اور ان کو بیچنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

7۔ عوام کی منفعت اور شارعِ عام کو وسیع کرنے وغیرہ کے لئے حاکمِ وقت شرعا مالکِ سے جبرا اور اس کی رضامندی کے بغیر اس کے جائیداد کو خرید کر منفعت عام میں شامل کر سکتا ہے۔

8۔ صرف "ضرورت" اور "عمومی حاجت" کے وقت جبری بیع کے جواز کی گنجائش ہے اور کسی صورت میں نہیں۔

9۔ کسی کی جائز ملکیت کو بلا معاوضہ اس کی رضامندی کے بغیر زبردستی لینا نہ فرد کے لیے جائز ہے اور نہ ہی حکومت کے لیے۔

10۔ اگر اسلامی حکومت مصالحِ عامہ کے پیش نظر حکم جاری کرے کہ آئندہ فلاں چیز مقررہ حد سے زیادہ اپنی ملکیت میں نہ رکھے تو ایسا حکم شریعت کے خلاف نہیں بلکہ واجب التعمیل ہے۔

خلاصہ:

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس لیے عبادات ہوں یا معاملات، عقائد ہوں یا اخلاقیات، غرضیکہ زندگی کے ہر موڑ پر اسلام نے اپنے پیروکاروں کی سیر حاصل رہنمائی فرمائی ہے۔ ہر مسلمان کے لیے اپنے دنیوی واخروی تمام معاملات میں شرعی احکام اور دینی تعلیمات کی پابندی از بس ضروری ہے۔ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ عبادات میں تو کتاب وسنت پر عمل پیرا ہو اور معاملات اور معاشرتی مسائل میں اپنی من مانی کرے او راپنے آپ کو شرعی پابندیوں سے آزاد تصور کرے۔ ہمارے دین کی وسعت وجامعیت ہے کہ اس میں ہر طرح کے تعبدی امور اور کاروباری معاملات ومسائل کا مکمل بیان موجود ہے او ہر مسلمان بہ آسانی انہیں سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ قرآن وسنت سے ماخوذ اصول وضوابط کے تحت ہر دور میں فقہائے عظام نے بڑی جانفشانی اور انتھک محنت وکوشش کر کے امت کو درپیش مسائل کا حل بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں فقہائے کرام نے مسائل کو آسانی کی خاطر مختلف ابواب میں تقسیم کئے ہیں، ان ابواب میں سے ایک باب "اکراہ" بھی ہے، اکراہ کے مسائل کا تعلق تقریباً ہر فقہی باب عقائد، معاملات اور عبادات وغیرہ سے ہے، جس کے اصول وجزئیات

کتبِ فقہ میں بکھرے ہوئے ہیں، ان اصول وجزئیات کو یکجا کرنے اور موجودہ دور میں ان سے متعلق پیش آنے والے مسائل کو ان اصول وجزئیات پر منطبق کرنے کی انتہائی ضرورت ہے، اسی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کا خلاصہ پیش کر دیا ہے تاکہ امت مسلمہ کے لئے رہنمائی کا سبب بنے۔